شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ
جون ۲۰۱۴ء

# ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
**تنظیمِ اسلامی**
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**تنظیمِ اسلامی کا منہج اور چند مغالطے**

مغربی استعمار سے پہلے
مسلم معاشروں میں خواتین کا چہرے کا پردہ

---

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

# بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

**حصہ اول** سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(آٹھواں ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 450 روپے

**حصہ دوم** سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

**حصہ سوم** سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

**حصہ چہارم** سورۃ یُونس تا سورۃ الکہف
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 460 روپے

**حصہ پنجم** سورۃ مریم تا سورۃ السجدۃ
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

★ عمدہ طباعت ★ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ★ امپورٹڈ آفسٹ پیپر

**ملنے کے پتے**

**انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور**
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

**مکتبہ خُدّام القرآن لاہور**
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-(042)35869501

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


جلد : 63
شمارہ : 6
شعبان المعظم 1435ھ
جون 2014ء
فی شمارہ -/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون
- اندرون ملک 250 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ




# مشمولات


عرضِ احوال — 5
نظامِ تعلیم کے چیلنجز اور ان کا حل — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القرآن — 11
سورۂ بنی اسراء یل (آیات ۵۳ تا ۷۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ — 25
تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے — جمیل الرحمٰن عباسی

تعمیرِ سیرت — 49
شُحُّ النَّفس — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تذکارِ صحابیاتؓ — 54
اُمّ المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا — حافظ محمد زاہد

ستر و حجاب — 63
مسلم معاشروں میں مغربی استعمار سے پہلے خواتین کا چہرے کا پردہ — ڈاکٹر گوہر مشتاق

اقوامِ عالم — 79
یہودیت کی بنیاد اور مختصر تاریخ — انجینئر محمد عامر یٰسین

یادِ رفتگاں — 87
علامہ محمد قطبؒ جوارِ رحمت میں — شاہ اجمل فاروق ندوی

توضیح و تنقیح — 95
تحریکِ شہیدین پر اعتراضات کا تجزیہ — محمد یاسر

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

# نظامِ تعلیم کے چیلنجز اور اُن کا حل

سورۃ العلق کی پہلی آیت ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ①﴾ ترتیبِ نزولی کے لحاظ سے قرآن پاک کی پہلی آیت ہے‘ یعنی وہ پہلی وحی جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ گویا مسلمانوں کے دین کا آغاز پڑھنے کی ہدایت کے ساتھ ہوا۔ پھر قرآن مجید سے ہم یہ دعا بھی سیکھتے ہیں: ’’رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا‘‘۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی دوسرے مذہب کی نسبت ہمارا دین علم کی اہمیت اور فضیلت ہم پر زیادہ زوردار انداز میں واضح کرتا ہے۔

انسان تمدن کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا جب انفرادیت سے اجتماعیت میں داخل ہوا اور باقاعدہ معاشرہ کی تشکیل ہوئی تب بھی اگرچہ ایک طویل مدت تک جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے معاشروں پر چھائے رہے‘ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کسی نہ کسی سمت سے‘ کسی نہ کسی انداز میں حصولِ علم کی بات تب بھی اُٹھائی جاتی تھی۔ بالآخر دنیا علم سے روشن ہوئی۔ یہ ایک بالکل الگ بحث ہے کہ اس میں سے کتنا علم نافع اور کتنا ضرر رساں ثابت ہوا۔ مسلمانوں کی عسکری یلغار نے جب سپین اور یورپ کے کچھ حصوں کو روندا تو یہ علاقے علمی لحاظ سے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ کاغذ نامی کسی شے سے آشنا نہ تھے۔ سائنسی علوم کا حصول ایک ایسا جرم تھا جس پر سزائے موت بھی دی جا سکتی تھی۔ مسلمانوں کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی دینی تعلیمات میں دُنیوی علم کے حصول کے لیے کہیں رکاوٹ نہ تھی۔ علمی تاریخ کا اگر جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی تو بات بہت طویل ہو جائے گی‘ لہٰذا ہم ایک بڑی چھلانگ لگاتے ہوئے یورپ کے صنعتی انقلاب کے دور میں پہنچ جاتے ہیں۔ صنعتی انقلاب سے پہلے کے یورپ میں کلیسا ایک بہت بڑی قوت تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اِس نے ریاست کے اندر ایک ریاست قائم کی ہوئی تھی۔ چونکہ بائبل میں صرف اخلاقی تعلیمات ہیں اور شریعت نہیں ہے‘ لہٰذا عیسائی مذہبی پیشوا اس خلا سے فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے بنائے ہوئے شرعی قانون نافذ کرتے تھے۔ ظاہر ہے اس میں عدل کا فقدان تھا اور یہ پاپائیت عام آدمی پر بڑی بھاری تھی۔ اسی لیے اہلِ



یورپ پر اس کا شدید ردعمل ہوا اور یورپی معاشرہ ایک یوٹرن لے گیا۔ یہ ایک لحاظ سے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا کہ اب ساری پستی اور پسماندگی کا ذمہ دار مذہب کو ٹھہرا دیا گیا اور اُسے دنیوی ترقی میں رکاوٹ قرار دے کر اجتماعی اور ریاستی سطح پر مکمل طور پر ناقابلِ قبول قرار دے دیا گیا کہ مذہب فرد کا انفرادی مسئلہ ہے‘ اِسے معاشرہ اور ریاست سے کچھ لینا دینا نہیں۔ گویا یورپ اب دنیا کو صرف ایک آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ دنیوی ترقی‘ مادی ترقی‘ یہ دنیا اور یہ کائنات ہی سب کچھ ہے‘ ہمیں اجتماعی طور پر اسی کی فکر ہو گی‘ آخرت کوئی شے نہیں۔ البتہ یہ کہ عقائد اور پرستش کے انسانی جذبے کو ایک نیا رنگ دیتے ہوئے وطن ہی کو خدا قرار دے دیا گیا‘ لہٰذا ایمانداری کو ایک اچھی پالیسی مانتے ہوئے اور دھوکہ دہی اور فریب کو ترقی کی راہ میں حائل قرار دیتے ہوئے یورپ اور دیگر سفید فام اقوام یکسو ہو کر ایک راستے پر چل پڑے۔ اور اللہ تو وہ راستے کھولتا چلا جاتا ہے جس راستے پر انسان عزم اور ارادے سے چلتا ہے۔ لہٰذا آج یہ اقوام سائنس اور ٹیکنالوجی میں اِس زمینی دنیا کی حدود عبور کر کے چاند اور مریخ میں بھی خود کو بسانے کی تگ و دو میں ہیں۔

اُمّتِ مسلمہ کا مسئلہ کیا ہوا‘ ہم طوالت کے خوف سے اِسے صرف پاکستان تک محدود کر دیتے ہیں۔ ہم مسلمان جو آج سے چھیاسٹھ سال پہلے ہندوستان نامی ملک کے باشندے تھے اِن مسلمانوں نے ’’لا الٰہ اِلا اللّٰہ‘‘ کی بنیاد پر زندہ مہاتما گاندھی کی لاش پر سے گزر کر پاکستان قائم کر لیا۔ پاکستان کے نام پر دُنیا کو ایک بہت بڑا اور کافی حد تک مبنی بر حقیقت (genuine) اعتراض یہ تھا کہ کیا صرف یہ لوگ پاک ہیں؟ بہرحال اسلام کے نام پر ایک ملک وجود میں آ گیا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کے ذریعے اِس ’’لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ‘‘ کے ساتھ ’’محمدٌ رسول اللّٰہ‘‘ کو جوڑ دیا گیا‘ یعنی ملک کی ایک باقاعدہ سمت معیّن کر دی گئی اور ملک کی گاڑی کو اسلام کی پٹڑی پر چڑھا دیا گیا۔ لیکن وہیں سے ہماری بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ مقتدر حلقے جو ذہنی طور پر سیکولر تھے اور اپنے لیے ’’لبرل‘‘ کی اصطلاح غلط طور پر استعمال کرتے تھے‘ حالانکہ حقیقت میں وہ فاشسٹ تھے‘ اُنہوں نے زبردستی اِس گاڑی کا رُخ اُلٹا پھیر دیا‘ یعنی انجن گاڑی کے آگے لگانے کی بجائے پیچھے کی طرف لگا دیا‘ جس سے گاڑی اپنی منزل کی مخالف سمت میں بڑھنے لگی اور ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ ہم منزل سے دُور سے دُور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اللہ اور محمد ﷺ کے نام میں ایک ایسی کشش ہے کہ قوم اپنی ساری بداعمالیوں کے

باوجود کم از کم نظری سطح پر خود کو مذہب سے الگ تھلگ نہیں کرسکی اور اس حوالہ سے یورپ کی طرح ''یکسو'' نہیں ہوسکی۔ اسی لیے ہمیں یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ:

Pakistan is still in search of her indentification

ہم یقیناً اِس وقت تک ایک confused قوم ہیں' ہم اجتماعی سطح پر ابہام کا شکار ہیں۔ ہمارا تعلیمی نظام بٹا ہوا ہے۔ یہ دینی مدارس ہیں' جہاں قال اللہ وقال قال رسول اللہ ﷺ کی صدائیں ہیں' یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کا گزر نہیں —— اور یہ کالج اور یونیورسٹیاں' جہاں اسلامیات اگر پڑھائی بھی جاتی ہے تو اِس انداز میں پڑھائی جاتی ہے کہ کسی صورت میں طالب علم کے لیے نافع اور شافی نہیں ہوتی اور وہ معصوم اذہان میں مزید کنفیوژن پیدا کر دیتی ہے۔ جس طرح ہمارے دو نظام ہائے تعلیم ہیں اِسی طرح ہمارے ہاں بدقسمتی سے تعلیم بھی طبقات میں منقسم ہے۔ امیر اور آسودہ حال طبقے کے لیے تعلیمی اداروں اور تعلیم کا معیار کچھ اور ہے اور عوامی طبقات کے لیے کچھ اور ہے۔

تیسری تقسیم یہ ہے کہ چھیاسٹھ سال میں ہم یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکے کہ ہمیں کس زبان میں کس میڈیم میں طالبِ علم کو علم دینا ہے۔ ایک طالب علم کی بدقسمتی کی انتہا ملاحظہ ہو۔ میں اِس وقت خاص طور پر پنجاب کی بات کروں گا جو آبادی کے لحاظ سے دو تہائی پاکستان کے مساوی ہے کہ پنجابی گھرانے میں بچہ والدین کو باہم پنجابی میں باتیں کرتے ہوئے سنتا ہے' لیکن والدین بچے سے اُردو میں بات کرتے ہیں۔ بچہ جب سکول جاتا ہے تو وہاں علم کا میڈیم انگریزی ہے' اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہم یورپ کی طرح مذہب سے صدفی صد الگ تھلگ نہیں ہوئے' لہٰذا جب بچہ دین سیکھنا چاہتا ہے تو ہمارے مذہب کی زبان عربی ہے۔ یعنی ہم بچے کی شخصیت کو آغاز ہی سے کئی حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ گویا کنفیوزڈ بچوں سے ایک کنفیوزڈ قوم وجود میں آ چکی ہے۔

ایک اور بدقسمتی نے ہمارا دامن مضبوطی سے تھاما ہوا ہے کہ بددیانتی اور دھوکہ دہی ہمارے رگ وپے میں سرایت کر گئی ہے۔ وطن پرستی نے یورپ کو دیانت داری سے کام لینا' دھوکہ دہی اور فریب سے اجتناب کرنا قومی سطح تک محدود رکھا ہوا ہے۔ میں یہاں یہ واضح کرنا ضروری سمجھوں گا کہ وطن اور قوم کی خاطر بین الاقوامی سطح پر دھوکہ دہی وطنی عبادت کا حصہ ہے۔ ہم چونکہ اُس طرح وطن پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوئے لہٰذا اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ جانا



اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ ہماری تمام تر جِدّوجُہد کا اصل ہدف اپنے معیار کو دنیوی لحاظ سے بہتر کرنا' دوسروں پر سبقت لے جانا اور اس برتری کو اگلی نسلوں میں منتقل کرنا' بن گیا۔ تعلیم کا اصل مقصد کردار سازی اور اچھے معاشرے کی تشکیل ہونا چاہیے تھا' لیکن عملاً ہوا یہ کہ ڈاکٹر' انجینئر بن کر' C.A کر کے قوم کو لوٹا جانے لگا۔ عالی شان بنگلوں کی تعمیر اور پُرآسائش گاڑیوں کا حصول طالب علموں کا مقصد بن کر رہ گیا۔ اِلا ماشاء اللہ! سچ پوچھیے یہ تعلیمی نظام تو لٹیرے پیدا کر رہا ہے۔ اس ملک کی تباہی وبربادی میں جتنا حصہ افسر شاہی خصوصاً C.S.P اور P.C.S حضرات کا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہے۔ یہ بات صدفی صد درست ہے کہ پاکستانیوں کو تعلیم یافتہ لوگوں نے لوٹا۔ گویا علم نافع کی بجائے ضرر رساں ثابت ہوا۔ اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہیے' بلکہ یہ ہے کہ ملک میں ایسا نظامِ تعلیم ہو جو باکردار اور صالح معاشرہ کے قیام میں مدد کرے۔

نظامِ تعلیم کے حوالہ سے یہ تاریخی واقعہ یاد کرنا چاہیے کہ جنگ عظیم میں جاپان نے اتحادیوں سے شکست کھانے کے بعد مذاکرات میں کہا تھا کہ آپ فاتح ہیں ہم مفتوح قوم ہیں' ہم آپ کی ہر شرط تسلیم کریں گے' سوائے اِس کے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں کسی قسم کی کوئی دخل اندازی نہ کی جائے' یہ ہم کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ جاپان کا دوبارہ ایک اقتصادی قوت بن جانا اِسی فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ایک اور تاریخی واقعہ بھی یاد کر لیجیے کہ جنگ آزادی میں شکست کے بعد ایک انگریز وائسرائے نے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں سے پوچھا تھا کہ

*Would you like to be governed by pen or by sword?*

بعد کے حالات نے بتایا کہ انہوں نے ہمیں تلوار سے زیادہ قلم کے ذریعے شکست دے کر اپنی تہذیبی اور ثقافتی فتح حاصل کی۔

اب نظامِ تعلیم کے حوالے سے چند عملی تجاویز پیش خدمت ہیں:

## (۱) یکساں نظامِ تعلیم

ایک ہی ملک میں مختلف نظام ہائے تعلیم بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ چنانچہ ہمارا دُنیوی اور دینی نظامِ تعلیم ایک ہی ہونا چاہیے۔ میٹرک کرنے والا ہر طالب علم اِس پوزیشن میں ہونا چاہیے کہ قرآن پاک کو بغیر ترجمہ دیکھے اچھی طرح سمجھ سکے' یعنی عربی زبان میں اُسے کم از کم اس حد تک عبور حاصل ہونا چاہیے۔ احادیث مبارکہ کی تعلیم انسانی کردار اور ایک صالح معاشرہ کی تشکیل

میں انتہائی اہم اور مفید رول ادا کرسکتی ہے‘ لہٰذا یہ بھی سب کے لیے نظامِ تعلیم کا حصہ ہوں۔ بعد ازاں جو دُنیوی اُمور میں آگے بڑھنا چاہیں یعنی ڈاکٹر‘ انجینئر‘ آئی ٹی ایکسپرٹ بننا چاہیں وہ مطلوبہ لائن اختیار کریں اور اُسی تعلیمی ادارے میں دینی تعلیمات کی specialization کا انتظام بھی ہو‘ جو نہ صرف مدرّس اور معلّم پیدا کرے بلکہ مفتی کورس بھی ہوں‘ یعنی ایک طالب علم مکمل طور پر عالمِ دین بن سکے۔

## (۲) قومی زبان میں تعلیم

اے کاش! ہم نے بالکل آغاز ہی میں سر آغا خان اور زاہد حسین (جو بعد میں سٹیٹ بینک کے گورنر بنے) کا یہ مشورہ قبول کرلیا ہوتا کہ عربی کو قومی زبان قرار دے دیتے۔ تمام تعلیمی سلسلہ عربی میں شروع کیا ہوتا تو آج جس طرح ہماری افسر شاہی فرفر انگریزی بولتی ہے یہی حیثیت عربی کو حاصل ہوتی۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اِس صورت میں بنگلہ دیش الگ ملک نہ بنتا۔ آج ہمارے گھروں‘ ہمارے سرکاری و غیر سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں میں ہر جگہ ایک ہی زبان ہوتی تو ہم دنیوی اور دینی دونوں لحاظ سے ترقی کی منازل طے کررہے ہوتے۔ بہرحال وہ موقع ہم نے ضائع کردیا‘ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ اردو کو انگریزی پر ترجیح دی جائے—— اس لیے کہ تاریخ گواہ ہے کہ کوئی قوم غیر زبان میں علم حاصل کر کے ترقی نہیں کرسکی۔

## (۳) طبقاتی تقسیم

ہماری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ تعلیم امیر اور غریب میں منقسم ہے۔ امیروں کے تعلیمی ادارے‘ اُن کا نصاب‘ معیار اور ماحول غریبوں کے تعلیمی اداروں سے یکسر مختلف ہیں۔ ایک طبقے کی کلاسز A/C سے یخ بستہ کمروں میں ہو رہی ہیں اور ایک طبقہ ایسے سکولوں میں پڑھ رہا ہے جہاں آگ برساتے سورج کی تپش روکنے کے لیے طلبہ کے سر پر چھت بھی نہیں‘ اور اسی سکول کی عمارت میں چودھری صاحب کے جانور بھی بندھے ہوتے ہیں۔ یہ ظالمانہ طبقاتی تقسیم بھی ختم کرنا ہوگی۔

## (۴) احترامِ استاد

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اب بھی اساتذہ کا احترام ہے‘ لیکن کالج اور یونیورسٹیاں اس احترام کو مکمل طور پر خیر باد کہہ چکی ہیں‘ جو انتہائی افسوسناک ہے اور ہمارے



علمی زوال کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ وہ شخص تمہارا استاد ہے جس نے تمہیں ایک لفظ یا حرف بتایا۔ اس معاملے میں مغرب نے ہماری روایت کو اپنایا۔ اردو ادب کا ایک بہت بڑا نام اشفاق احمد اس حوالہ سے ایک ذاتی واقعہ بیان کرتے تھے جو ہمارے طالب علموں کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جرمن یونیورسٹی میں اردو کا استاد تھا‘ میرا ٹریفک چالان ہوگیا جس کی میں بروقت ادائیگی نہ کرسکا۔ مجھے عدالت سے سمن آ گیا‘ میں عدالت حاضر ہوا۔ جج نے جرمانہ سنا دیا‘ میں نے جرمانہ ادا کردیا۔ جج نے اتفاق سے پوچھ لیا کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں یونیورسٹی میں استاد ہوں۔ وہ جج اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور کہنے لگا: ایک استاد عدالت میں! وہ میرے پاس آیا اور مجھے عدالت سے باہر تک عزت و احترام سے چھوڑ کر آیا۔ مسلمانوں کی ترقی کا دور بھی اسی نوعیت کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ خلیفۂ وقت بھی استاد کی بہت عزت کرتا تھا۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ ناپید ہے۔ احترامِ استاد کے بغیر علم سودمند ثابت نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک اساتذہ کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ قوم کے دوسرے طبقات سے مختلف نہیں۔ اس کی تلافی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام جو انسان کے معاشی استحصال کے حوالہ سے انسانی تاریخ کا بدترین استحصالی نظام ہے اُس کی جگہ اسلام کے عادلانہ نظام کا پاکستان میں نفاذ نہیں ہو جاتا‘ جب تک نظریہ پاکستان کو عملی تعبیر نہیں مل جاتی‘ جب تک پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست نہیں بن جاتا!!

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُورۃ بَنِی اِسْرائِیل

## آیات ۵۳ تا ۶۰

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ
الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ
اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ
زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾ قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ
وَلَا تَحْوِیْلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ
اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ
مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾ وَاِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا
عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾ وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ
بِالْاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا
بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ﴿۵۹﴾ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ
بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْۤ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ
الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا كَبِیْرًا ﴿۶۰﴾

**آیت ۵۳** ﴿وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ﴾ ’’اور آپؐ میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہی بات کہیں جو بہت اچھی ہو۔‘‘



یہاں وہ نکتہ ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی قبل ازیں وضاحت ہو چکی ہے کہ مکی سورتوں میں اہل ایمان کو براہِ راست مخاطب نہیں کیا گیا۔ اُن سے براہِ راست تخاطب کا سلسلہ (یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) تحویل قبلہ کے بعد شروع ہوا‘ جب انہیں باقاعدہ اُمتِ مسلمہ کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ اس سے پہلے اہلِ ایمان کو رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہی مخاطب کیا جاتا رہا۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت یہاں بھی حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ میرے بندوں (مؤمنین) کو میری طرف سے یہ بتا دیں کہ وہ ہر حال میں خوش اخلاقی کا مظاہرہ کریں اور گفتگو میں کبھی ترشی اور تلخی نہ آنے دیں۔ اس طرح آپس میں بھی شیر و شکر بن کر رہیں اور مخالفین کے سامنے بھی بہتر اخلاق کا نمونہ پیش کریں —— اقامتِ دین کے اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے مؤمنین کے سامنے بہت زیادہ رکاوٹیں ہیں۔ ان کے مخاطبین جہالت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کے جاہلانہ اعتقادات نسلوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اسی طرح انہیں اپنے رسم و رواج‘ سیاسی و معاشی مفادات اور غیرت و حمیت کے جذبات بہت عزیز ہیں۔ انہیں اس سب کچھ کا دفاع کرنا ہے اور اس کے لیے وہ ہر طرح کی قربانیاں دینے کو تیار ہیں۔ ان حالات میں داعیانِ حق کو تحمل‘ بردباری اور برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اشتعال میں آ کر اعلیٰ اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں۔

﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾﴾ ’’یقیناً شیطان ان کے درمیان جھگڑا ڈالے گا۔ یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔‘‘

**آیت ۵۴** ﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ؕ﴾ ’’تمہارا ربّ تم سے خوب واقف ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو تم پر رحم فرمائے گا‘ یا اگر چاہے گا تو تمہیں عذاب دے گا۔‘‘

﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۵۴﴾﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔‘‘

ہدایت کو قبول کرنا یا نہ کرنا ہر شخص کا ذاتی معاملہ اور ذاتی انتخاب ہے۔ آپ ﷺ ان تک پیغام پہنچانے کے ذمہ دار ہیں‘ انہیں ہدایت پر لانے کے مکلف نہیں۔

**آیت ۵۵** ﴿وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ’’اور آپؐ کا رب خوب جانتا ہے اس کو جو کوئی ہے آسمانوں اور زمین میں۔‘‘

﴿وَلَقَدۡ فَضَّلۡنَا بَعۡضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعۡضٍ﴾ ''اور ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت بخشی ہے''

یہاں اس فقرے کے سیاق و سباق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل مکی دور کے آخری برسوں میں نازل ہوئی اور اس کا آغاز بھی بنی اسرائیل کی تاریخ سے ہوا۔ اس سورۃ کے نزول سے پہلے نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت اور قرآن کے بارے میں تمام خبریں مدینہ پہنچ چکی تھیں اور یہودِ مدینہ ایک ایک بات اور ایک ایک خبر کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے۔ پھر عنقریب حضور ﷺ خود بھی مدینہ تشریف لانے والے تھے۔ ان حالات میں جب مسلمانوں کا یہودیوں کے ساتھ عقائد و نظریات کے بارے میں تبادلہ خیالات ہونا تھا تو انبیاء کرامؑ کے فضائل کے بارے میں سوالات کا اٹھنا ناگزیر تھا' کہ اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں تو آپ ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام میں سے افضل کون ہیں؟ یا یہ مسئلہ کہ محمد ﷺ افضل ہیں یا عیسیٰ علیہ السلام؟ چنانچہ اس حوالے سے یہاں ایک بنیادی اور اصولی بات بیان فرما دی گئی کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان میں موجود اپنی تمام مخلوق کے احوال و کیفیات سے خوب واقف ہے اور اس نے اپنے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۳ میں یہی بات یوں بیان فرمائی گئی ہے: ﴿تِلۡکَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ۘ﴾ ''یہ رسول ہیں ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے''۔ ایسا نہ ہو کہ اس بحث میں پڑ کر آپ لوگ اپنے نبی ﷺ کی فضیلت اس طرح بیان کریں کہ مخالفین کے منفی جذبات کو ہوا ملے اور وہ تعصب سے مغلوب ہو کر آپؐ کی بات ہی سننے سے انکار کر دیں۔

یہ بہت نازک مسئلہ ہے اور اس کی نزاکت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ تمام انبیاء کرامؑ سے افضل ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ سب سے افضل ہیں' مگر موقع و محل دیکھے بغیر اپنے اس عقیدے کا اس طرح سے چرچا کرنا درست نہیں کہ اس سے دوسرے مشتعل ہوں اور ان کے مخالفانہ جذبات و خیالات کو انگیخت ملے۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کی واضح حدیث ہے کہ ((لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللّٰہِ))(۱) ''اللہ کے نبیوں کے مابین درجہ بندی نہ کیا کرو''۔ آپ ﷺ نے مزید فرمایا: ((لَا یَنْبَغِیْ لِعَبْدٍ

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب قول اللہ تعالیٰ وَاِنَّ یُوۡنُسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ...... وصحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب من فضائل موسیٰ علیہ السلام۔



اَنۡ یَقُوۡلَ اَنَا خَیۡرٌ مِنۡ یُوۡنُسَ بۡنِ مَتّٰی))(۱) ''کسی شخص کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ یوں کہے کہ میں (محمد ﷺ) یونس بن متیٰ سے افضل ہوں''۔ آپ ﷺ نے یہاں حضرت یونس کا ذکر شاید اس لیے فرمایا کہ حضرت یونس علیہ السلام واحد نبی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ گرفت ہوئی ہے۔ بہر حال آپ ﷺ نے واضح طور پر اس سے منع فرمایا ہے کہ دوسرے انبیاء پر آپؐ کی فضیلت کا پرچار کیا جائے۔

﴿وَّاٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۵۵﴾﴾ ''اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی تھی''۔

اسی سیاق و سباق کی مناسبت سے یہاں بنی اسرائیل کے ایک نبی کا تذکرہ فرما دیا اور آپؑ کی فضیلت بھی بیان فرما دی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو ہم نے زبور جیسی جلیل القدر کتاب عطا فرمائی تھی۔ یہاں پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ موقع و محل کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسلؑ کے فضائل اور اعلیٰ مراتب کے ذکر سے ان کی عزت افزائی کرتا ہے۔

**آیت ۵۶** ﴿قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ فَلَا یَمۡلِکُوۡنَ کَشۡفَ الضُّرِّ عَنۡکُمۡ وَلَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۵۶﴾﴾ ''آپؐ کہیے کہ ان کو پکار دیکھو جن کو تم نے اُس کے سوا (معبود) گمان کر رکھا ہے' تو نہ انہیں کچھ اختیار حاصل ہے تم سے کوئی تکلیف دُور کرنے کا اور نہ ہی (تمہاری حالت) بدلنے کا''۔

**آیت ۵۷** ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الۡوَسِیۡلَۃَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ﴾ ''وہ لوگ جنہیں یہ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے قرب کے متلاشی ہیں کہ ان میں سے کون (اُس کے) زیادہ قریب ہے''

لفظ ''وسیلہ'' بمعنی قرب اس سے پہلے ہم سورۃ المائدۃ (آیت ۳۵) میں پڑھ چکے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں اللہ کے بندے اللہ کے ہاں اپنے درجات بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں اسی طرح عالمِ غیب یا عالمِ امر میں بھی تقرب الی اللہ کی یہ درجہ بندی موجود ہے۔ جیسے فرشتوں میں طبقۂ اسفل کے فرشتے' پھر درجۂ اعلیٰ کے فرشتے اور پھر ملائکہ مقربین ہیں۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب قول اللہ تعالیٰ وَاِنَّ یُوۡنُسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ...... وصحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب فی ذکر یونس علیہ السلام وقول النبی ﷺ لا ینبغی لعبد ان یقول انا خیر من یونس بن متی۔

اللہ کی شریک ٹھہرائی جانے والی شخصیات میں سے کچھ تو ایسی ہیں جو بالکل خیالی ہیں اور حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ہر زمانے میں لوگ انبیاء' اولیاء اللہ اور فرشتوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں شریک سمجھتے رہے ہیں۔ ایسی ہی شخصیات کے بارے میں یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ چاہے انبیاء و رسل ہوں' یا اولیاء اللہ' یا فرشتے' وہ تو عالم امر میں خود اللہ کی رضا جوئی کے لیے کوشاں اور اس کے قرب کے متلاشی ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں متعدد بار ذکر ہوا ہے کہ ایسی تمام شخصیات جنہیں دنیا میں مختلف انداز میں اللہ کے سوا پکارا جاتا تھا قیامت کے دن اپنے عقیدت مندوں کے مشرکانہ نظریات سے اظہارِ بیزاری کریں گی اور صاف کہہ دیں گی کہ اگر یہ لوگ ہمارے پیچھے ہمیں اللہ کا شریک ٹھہراتے رہے تھے تو ہمیں اس بارے میں کچھ خبر نہیں۔

﴿وَیَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَہٗ وَیَخَافُوۡنَ عَذَابَہٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحۡذُوۡرًا ﴿۵۷﴾﴾

''اور وہ امیدوار ہیں اُس کی رحمت کے اور ڈرتے رہتے ہیں اُس کے عذاب سے۔ واقعتاً آپؐ کے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے۔''

**آیت ۵۸** ﴿وَاِنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا نَحۡنُ مُہۡلِکُوۡہَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ اَوۡ مُعَذِّبُوۡہَا عَذَابًا شَدِیۡدًا ؕ﴾ ''اور نہیں ہے کوئی بستی مگر ہم اسے ہلاک کر کے رہیں گے روزِ قیامت سے قبل یا ہم عذاب دیں گے اُسے بہت ہی شدید عذاب۔''

یہ اشارہ ہے اُس بہت بڑی تباہی کی طرف جو قیامت سے پہلے اس دنیا پر آنے والی ہے۔ سورۃ الکہف کی دوسری آیت میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: ﴿لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ﴾۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف کا آپس میں چونکہ زوجیت کا تعلق ہے اس لیے یہ مضمون ان دونوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔ احادیث میں المَلحمة العُظمٰی کے نام سے ایک بہت بڑی جنگ کی پیشین گوئی کی گئی ہے جو قیامت سے پہلے دنیا میں برپا ہوگی۔ آیت زیر نظر میں اُسی تباہی کا ذکر ہے جس سے روئے زمین پر موجود کوئی بستی محفوظ نہیں رہے گی۔ سورۃ الکہف میں زیادہ صراحت کے ساتھ اس کا تذکرہ آئے گا۔

اس وقت دنیا میں ایٹمی جنگ چھڑنے کا امکان ہر وقت موجود ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی وقت ایسا سانحہ رونما ہو جاتا ہے تو ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے دنیا پر جو تباہی آئے گی اس کو تصور



میں لانا بھی مشکل ہے۔ ان حالات میں المَلحمة العُظمٰی کے بارے میں پیشین گوئیاں آج مجسّم صورت میں سامنے کھڑی نظر آتی ہیں۔

﴿کَانَ ذٰلِکَ فِی الۡکِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا ﴿۵۸﴾﴾ ''یہ (اللہ کی) کتاب میں لکھا ہوا ہے۔''

یعنی یہ طے شدہ امور میں سے ہے۔ ایک وقت معین پر یہ سب کچھ ہو کر رہنا ہے۔

**آیت ۵۹** ﴿وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ کَذَّبَ بِہَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ﴾ ''اور ہمیں نہیں روکا (کسی اور بات نے) کہ ہم نشانیاں بھیجیں' سوائے اس کے کہ ان کو جھٹلا دیا تھا پہلے لوگوں نے۔''

اللہ تعالیٰ نے حسی معجزات دکھانے صرف اس لیے بند کر دیے ہیں کہ سابقہ قوموں کے لوگ ایسے معجزات کو دیکھ کر بھی کفر پر ڈٹے رہے اور ایمان نہ لائے۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ الانعام اور اس کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں تسلسل سے دہرایا جا رہا ہے۔

﴿وَاٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَۃَ مُبۡصِرَۃً فَظَلَمُوۡا بِہَا ؕ﴾ ''اور ہم نے قومِ ثمود کو اونٹنی دی آنکھیں کھول دینے والی نشانی (کے طور پر) تو انہوں نے اس کے ساتھ بھی ظلم کیا۔''

قومِ ثمود کو ان کے مطالبے پر اونٹنی کا بصیرت افروز معجزہ دکھایا گیا مگر انہوں نے اس واضح معجزے کو دیکھ لینے کے بعد بھی حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لانے کے بجائے اس اونٹنی ہی کو مار ڈالا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مٹی سے زندہ پرندے بنانے اور ''قُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰہِ'' کہہ کر مُردوں کو زندہ کرنے تک کے معجزات دیے گئے' مگر کیا انہیں دیکھ کر وہ لوگ ایمان لے آئے؟

﴿وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ﴿۵۹﴾﴾ ''اور ہم نہیں بھیجتے نشانیاں مگر صرف ڈرانے کے لیے۔''

نشانیاں یا معجزے بھیجنے کا مقصد تو لوگوں کو خبردار کرنا ہوتا ہے' سو یہ مقصد قرآن کی آیات بخوبی پورا کر رہی ہیں۔ اس کے بعد اب اور کون سی نشانیوں کی ضرورت باقی ہے؟ اگلی آیت میں یہی بات تین مثالوں سے مزید واضح کی گئی ہے کہ یہ لوگ کس طرح قرآن کی آیات کے ساتھ بحث برائے بحث اور انکار کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور یہ کہ اللہ نے حسی معجزات دکھانا کیوں بند کر دیے ہیں۔

**آیت ۶۰** ﴿وَاِذۡ قُلۡنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ﴾ ''اور جب ہم آپؐ سے کہتے

ہیں کہ آپؐ کے رب نے لوگوں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔''

قرآن حکیم کی بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے‘ مثلاً: ﴿وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۲۰﴾ (البروج) ''اور اللہ ان کا ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے''۔ یہ لوگ جب ایسی آیات سنتے ہیں تو ڈرنے کی بجائے فضول بحث پر اتر آتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ کہاں ہے اللہ؟ ہمارا احاطہ کیوں کر ہوا ہے؟

اگر فلسفیانہ پہلو سے دیکھا جائے تو اس آیت میں ''حقیقت و ماہیتِ وجود'' کے موضوع سے متعلق اشارہ پایا جاتا ہے جو فلسفے کا مشکل ترین مسئلہ ہے اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا نہیں ہے‘ یعنی ایک وجود خالق کا ہے‘ وہ ہر جگہ‘ ہر آن موجود ہے‘ اور ایک وجود مخلوق یعنی اس کائنات کا ہے۔ اب خالق و مخلوق کے مابین ربط کیا ہے؟ اس سلسلے میں کچھ لوگ ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے قائل ہو گئے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ کائنات ہی خدا ہے‘ خدا نے ہی کائنات کا روپ دھار لیا ہے‘ جیسے خدا خود ہی انسانوں کا روپ دھار کر ''اوتار'' کی صورت میں زمین پر آ جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا کفر اور شرک ہے۔ دوسری طرف اگر یہ سمجھیں کہ اللہ کا وجود اس کائنات میں نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس کا وجود کہیں الگ ہے اور وہ نعوذ باللہ کہیں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمیں بس اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کا وجود مطلق (Absolute) ہے۔ وہ حدود و قیودِ زمان و مکان‘ کسی سمت یا جہت کے تصور سے ماوراء‘ وراء الوراء‘ ثم وراء الوراء ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ ''اور نہیں بنایا ہم نے اس مشاہدے کو جو ہم نے آپؐ کو دکھایا تھا مگر ایک فتنہ لوگوں کے لیے''

یہاں پر لفظ ''رُءیا'' خواب کے معنی میں نہیں آیا بلکہ اس سے رُؤیت بصری مراد ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہے اس پر بھی ''رُءیا'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شبِ معراج میں حضورﷺ کو جو مشاہدات کرائے تھے اور جو نشانیاں آپﷺ کو دکھائی تھیں اُن کی تفصیل جب کفارِ مکہ نے سنی تو یہ معاملہ ان کے لیے ایک فتنہ بن گیا۔ وہ نہ صرف خود اس کے منکر ہوئے‘ بلکہ اس کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو اُن کے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس واقعہ کو بنیاد بنا کر انہوں نے پوری شدومد سے یہ پرچار شروع کر دیا کہ محمد (ﷺ) پر جنون کے اثرات ہو چکے ہیں (معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ)۔ اس زمانے میں جب مکہ سے بیت



المقدس پہنچنے میں پندرہ دن لگتے تھے‘ یہ دعویٰ انتہائی ناقابلِ یقین معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص راتوں رات نہ صرف بیت المقدس سے ہو آیا ہے بلکہ آسمانوں کی سیر بھی کر آیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے موقع غنیمت سمجھ کر اس موضوع کو خوب اچھالا اور مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر بحث مباحثے کیے۔ اس طرح نہ صرف یہ بات کفار کے لیے فتنہ بن گئی بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک آزمائش قرار پائی۔

جب یہی ناقابلِ یقین بات ان لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کی اور آپؓ سے تبصرہ چاہا تو آپؓ نے بلاتوقف جواب دیا کہ اگر واقعی حضورﷺ نے ایسا فرمایا ہے تو یقیناً سچ فرمایا ہے‘ کیونکہ جب میں یہ مانتا ہوں کہ آپﷺ کے پاس آسمانوں سے ہر روز فرشتہ آتا ہے تو مجھے آپﷺ کا یہ دعویٰ تسلیم کرنے میں آخر کیونکر تامل ہوگا کہ آپﷺ راتوں رات آسمانوں کی سیر کر آئے ہیں! اسی بلا تامل تصدیق کی بنا پر اس دن سے حضرت ابوبکرؓ کا لقب ''صدیق اکبرؓ'' قرار پایا۔

﴿وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ط﴾ ''اور اُس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت وارد ہوئی ہے۔''

اسی طرح جب قرآن میں زقوم کے درخت کا ذکر آیا اور اس کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ اس درخت کی جڑیں جہنم کی تہہ میں ہوں گی (الصافات:۶۴) اور وہاں سے یہ جہنم کی آگ میں پروان چڑھے گا تو یہ بات بھی ان لوگوں کے لیے فتنے کا باعث بن گئی۔ بجائے اس کے کہ وہ لوگ اسے اللہ کی قدرت سمجھ کر تسلیم کر لیتے‘ اُلٹے اس بات پر تمسخر اور استہزا کرنے لگے کہ آگ کے اندر بھلا درخت کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟ انہیں کیا معلوم کہ یہ اُس عالم کی بات ہے جس کے طبعی قوانین اس دنیا کے طبعی قوانین سے مختلف ہوں گے اور جہنم کی آگ کی نوعیت اور کیفیت بھی ہماری دنیا کی آگ سے مختلف ہوگی۔

﴿وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۶۰﴾ ''اور (ان باتوں سے) ہم تو انہیں تنبیہہ کرتے ہیں مگر یہ تنبیہہ ان کی سرکشی ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔''

قرآن میں یہ سب باتیں انہیں خبردار کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں‘ مگر یہ ان لوگوں کی بدبختی ہے کہ اللہ کی آیات سن کر ڈرنے اور ایمان لانے کی بجائے وہ مزید سرکش ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی سرکشی میں روز بروز مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

# آیات ۶۱ تا ۶۵

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ
خَلَقْتَ طِيْنًا ۝۶۱ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۶۲ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ
جَهَنَّمَ جَزَاۗؤُكُمْ جَزَاۗءً مَّوْفُوْرًا ۝۶۳ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ
وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ
وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۶۴ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝۶۵

**آیت ۶۱** ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ﴾ ’’اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدمؑ کو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہیں کیا)۔‘‘

﴿قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝۶۱﴾ ’’اُس نے کہا کہ کیا میں اُسے سجدہ کروں جسے تو نے پیدا کیا ہے مٹی سے؟‘‘

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا یہ قصہ یہاں چوتھی مرتبہ بیان ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے سورۃ البقرۃ رکوع ۴‘ سورۃ الاعراف رکوع ۲ اور سورۃ الحجر رکوع ۳ میں اس قصے کا ذکر ہو چکا ہے۔

**آیت ۶۲** ﴿قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۶۲﴾ ’’اُس نے (مزید) کہا کہ ذرا دیکھ تو اُس کو جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے‘ اگر تو مجھے مہلت دے دے قیامت کے دن تک‘ تو میں اس کی پوری نسل کو قابو میں کر کے چھوڑوں گا‘ سوائے بہت تھوڑے سے لوگوں کے۔‘‘

**آیت ۶۳** ﴿قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاۗؤُكُمْ جَزَاۗءً مَّوْفُوْرًا ۝۶۳﴾ ’’اللہ نے فرمایا: جاؤ (دفع ہو جاؤ!) ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں گے تو یقیناً تم سب کی سزا جہنم ہوگی‘ وافر سزا۔‘‘



**آیت ۶۴** ﴿وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ﴾ ’’اور تو پھسلا لے جس پر تیرا بس چلتا ہے ان میں سے اپنی آواز سے‘‘

عربی میں بکری کے ایسے نوزائیدہ بچے کو فزّ کہتے ہیں جو ابھی ٹھیک سے چلنے کے قابل نہ ہو اور کھڑا ہونے کی کوشش میں اس کی ٹانگیں لڑکھڑاتی ہوں۔ اس مناسبت سے یہ لفظ محاورۃً اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کی ٹانگیں کسی معاملے میں لڑکھڑا جائیں‘ قدم ڈگمگا جائیں اور ہمت جواب دے دے۔

﴿وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ﴾ ’’اور چڑھا لا اُن پر اپنے سواروں اور پیادوں کو اور شریک بن جا اُن کا مالوں میں اور اولاد میں‘ اور ان سے (جو چاہے) وعدے کر!‘‘

﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۶۴﴾ ’’اور نہیں وعدہ کرتا اُن سے شیطان مگر دھوکے کا۔‘‘

**آیت ۶۵** ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ﴾ ’’یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا۔‘‘

تم انسانوں کو بہکانے اور پھسلانے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کر لو‘ ان کے دلوں میں وسوسے ڈالو‘ ان سے جھوٹے سچے وعدے کرو اور انہیں سبز باغ دکھاؤ۔ یہ تمام حربے تو تم استعمال کر سکتے ہو‘ لیکن تمہیں یہ اختیار ہرگز نہیں ہوگا کہ تم میرے کسی بندے کو اس کی مرضی کے خلاف گمراہی کے راستے پر لے جاؤ۔

﴿وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝۶۵﴾ ’’اور کافی ہے تیرا رب بطور کارساز۔‘‘

وہ بندے جو شیطان سے بچنا چاہیں گے اللہ ان کی مدد کرے گا‘ اور جس کسی کا مددگار اور کارساز اللہ ہو اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی‘ وہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

# آیات ۶۶ تا ۷۲

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ
رَحِيْمًا ۝۶۶ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ

اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ
جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ
اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ
فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ
اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى
كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ
كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِيْ
هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

**آیت ۶۶** ﴿رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾ ''تمہارا ربّ وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لیے کشتیوں کو سمندر میں تاکہ تم اُس کا فضل تلاش کر سکو۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾﴾ ''یقیناً وہ تم پر بہت ہی رحیم ہے۔''

**آیت ۶۷** ﴿وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ﴾ ''اور جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے سمندر میں''

جب کشتی طوفان میں گھر جاتی ہے اور موت سامنے نظر آنے لگتی ہے تو:

﴿ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ﴾ ''گم ہو جاتے ہیں وہ سب جنہیں تم پکارتے ہو سوائے اُس (ایک اللہ) کے۔''

اس وقت تمہیں اپنے ان معبودوں میں سے کوئی بھی یاد نہیں رہتا جنہیں تم عام حالات میں اپنا مددگار سمجھتے ہو۔ اس آڑے وقت میں تم صرف اللہ ہی کو مدد کے لیے پکارتے ہو۔ یہ مضمون قرآن میں متعدد بار آ چکا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾﴾ ''پھر جب وہ تمہیں بچا لاتا ہے خشکی کی طرف تو تم منہ موڑ لیتے ہو۔ اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔''



**آیت ۶۸** ﴿اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ﴾ ''تو کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ دھنسا دے تمہیں کہیں خشکی میں ہی؟''

جب تم جان بچا کر سمندر سے خشکی پر آتے ہو تو پھر اللہ کی ناشکری کرتے ہوئے اس سے منہ موڑ لیتے۔ کیا تمہیں اس بات سے خوف نہیں آتا کہ اگر اللہ چاہے تو تمہیں خشک زمین ہی کے اندر دھنسا دے؟ کیا خشکی پر لوگوں کو موت نہیں آتی؟

آسودۂ ساحل تُو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اُٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں!

﴿اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾﴾ ''یا وہ تم پر بھیج دے کنکر برسانے والی تیز ہوا، پھر تم نہ پاؤ اپنے لیے کوئی بچانے والا!''

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ چاہے تو سنگریزوں والی خوفناک آندھی سے بھی تمہیں ہلاک کر سکتا ہے۔

**آیت ۶۹** ﴿اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ﴾ ''یا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے کہ وہ پھیر لے جائے تمہیں اسی (سمندر) میں دوسری مرتبہ، پھر بھیج دے تم پر ہوا کا زوردار جھکڑ''

﴿فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾﴾ ''سو تمہیں غرق کر دے تمہارے کفر کی پاداش میں، پھر تم نہ پاؤ اپنے لیے ہمارے خلاف اس کی وجہ سے کوئی تعاقب کرنے والا!''

پھر ایسا نہیں کہ کوئی ہم سے باز پرس کر سکے کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں کیا؟

**آیت ۷۰** ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ﴾ ''اور ہم نے بڑی عزت بخشی ہے اولادِ آدمؑ کو''

یہ آیت بہت واضح انداز میں اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج (climax) انسان ہے۔ اس فلسفے کی وضاحت سورۃ النحل کی آیت ۴۰ کی تشریح کے ضمن میں ہو چکی ہے۔ وہاں میں نے بہت تفصیل سے کائنات اور انسان کی تخلیق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات کا نقطہ آغاز اللہ تعالیٰ کا

امر کُن ہے۔ حرفِ کُن سے خنک نور کا ظہور ہوا‘ اس نور سے ملائکہ اور انسانی ارواح کی تخلیق ہوئی‘ پھر Big Bang کے نتیجے میں حرارت کا گولا وجود میں آیا‘ جس کے متحرک ذرات سے کہکشائیں‘ ستارے اور سیارے بنے۔ اسی دور میں اس حرارت سے جنات کی تخلیق ہوئی۔ دوسرے بے شمار ستاروں اور سیاروں کی طرح ہماری زمین بھی ابتدا میں بہت گرم تھی۔ یہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوئی۔ پھر اس پر ہزاروں برس مسلسل بارش برستی رہی‘ جس سے زمین پر ہر طرف پانی پھیل گیا۔ اس کے بعد زمین پر نباتاتی اور حیوانی حیات کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد پھر تمام مخلوق کے بادشاہ ’’انسان‘‘ کی تخلیق عمل میں آئی۔ اس پورے فلسفے کو مرزا بیدل نے اپنے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے:ے

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!

اس خوبصورت شعر کا مفہوم و مطلب بھی سورۃ النحل کی مذکورہ آیت کی تشریح کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ ’’اور ہم اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں‘‘

یہاں ’’ہم‘‘ سے اللہ تعالیٰ کا نظامِ قدرت مراد ہے‘ جس کے تحت بحر و بر میں انسانوں کی مختلف نوعیت کی سرگرمیاں ممکن بنا دی گئیں ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے یہ معاون اور دوستانہ ماحول انسان کو اپنی گود میں اٹھائے ہوئے ہے۔

﴿وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾﴾

’’اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر‘ بہت بڑی فضیلت۔‘‘

**آیت ۷۱** ﴿یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ﴾ ’’جس دن ہم بلائیں گے تمام انسانوں کو ان کے سرداروں کے ساتھ۔‘‘

پھر ذرا اُس دن کا خیال کرو جس دن تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کے لیے اس طرح بلایا جائے گا کہ ہر گروہ اپنے راہنما یا لیڈر کے ساتھ حاضر ہوگا۔ پچھلی آیات میں تمام



مخلوق پر انسان کی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب انسان کو اس کائنات میں اس قدر اعلیٰ مقام اور مرتبے سے نوازا گیا ہے تو پھر اس کا محاسبہ بھی ہونا چاہیے: ع ’’جن کے رتبے ہیں سوا‘ ان کی سوا مشکل ہے!‘‘

﴿فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾﴾

’’تو جس کو دیا جائے گا اُس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں تو ایسے لوگ پڑھیں گے اپنے اعمال نامہ کو (خوشی کے ساتھ) اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا دھاگے کے برابر بھی۔‘‘

**آیت ۷۲** ﴿وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۷۲﴾﴾

’’اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا‘ اور راہ سے بہت دور بھٹکا ہوا۔‘‘

جس شخص نے اس دنیا میں اپنی پوری زندگی حیوانوں کی طرح گزار دی‘ جس کا دیکھنا اور سننا حیوانوں کا سا دیکھنا اور سننا تھا‘ جس نے نہ تو انفس و آفاق میں بکھری ہوئی اللہ تعالیٰ کی ان گنت نشانیوں کو چشمِ بصیرت سے دیکھا نہ ان کے ذریعے سے اپنے خالق و مالک کو پہچانا‘ اُس نے اپنی زندگی گویا اندھے پن میں گزار دی۔ ایسے شخص کو قیامت کے دن ایسی حالت میں اٹھایا جائے گا کہ وہ اندھا ہوگا۔ اسی اندھے پن سے بچنے کے لیے علامہ اقبال نے کیا خوب نصیحت کی ہے: ع ’’دیدن دگر آموز‘ شنیدن دگر آموز!‘‘

❁❁❁


جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے — اشاعت عام: 15 روپے

# تنظیمِ اسلامی کا منہج اور چند مغالطے

جمیل الرحمٰن عباسی ☆

ماہنامہ البرہان‘ بابت ماہ دسمبر۲۰۱۳ء میں جناب محمد رشید صاحب کا ایک مضمون ’’غلبۂ اسلام بذریعہ احتجاجی سیاست: تنظیم اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات‘‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس مضمون میں تنظیم کے فکر و طریق پر کچھ نقد فرمایا گیا ہے۔ یہ تنقید امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید صاحب حفظہ اللہ کے اُس خطاب کی روشنی میں کی گئی ہے جو اُنہوں نے ’’پاکستان میں اس کے قیام سے اب تک‘ احیائے اسلام کی کوششوں کا جائزہ‘‘ کے عنوان سے سیمینار (منعقدہ ۲۱ جون ۲۰۱۳ء بمقام کراچی) میں ارشاد فرمایا تھا۔ بعد ازاں یہ خطاب ماہنامہ میثاق کی اشاعت بابت اکتوبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ صاحب مضمون نے تنظیم اسلامی کے فکر و طریق کار پر جو اعتراضات وارد فرمائے ہیں اُس حوالے سے چند وضاحتیں ذیل میں تحریر کی جا رہی ہیں:

## پہلا اعتراض

صاحبِ مضمون لکھتے ہیں:

تنظیم اسلامی کے امیر محترم حافظ عاکف سعید صاحب اپنے خطاب بعنوان ’’پاکستان میں اس کے قیام سے اب تک ...... احیائے اسلام کی کوششوں کا جائزہ‘‘ (منعقدہ ۲۱ جون ۲۰۱۳ء بمقام کراچی‘ شائع شدہ ماہنامہ میثاق بابت اکتوبر ۲۰۱۳ء) میں مولانا مودودی مرحوم کی ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہونے والی ایک نہایت اہم تحریر کا حوالہ دیتے ہیں‘ جس میں مولانا مرحوم نے فرمایا کہ:

’’واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔‘‘

اس کے بعد سید مودودی مرحوم پہلے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے ’’انتخابات‘‘ کو ایک عارضی اور آزمائشی طریقہ کے طور پر ذکر کرنے کے بعد دوسرے طریقے کی تفصیل ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

☆ معاون مرکزی ناظم تعلیم و تربیت tarbiah.a@tanzeem.org



’’دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔‘‘

اس کے بعد مولانا نے تحریر فرمایا کہ ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں‘ اگر اس میں ناکام ہوئے تو ہم دوسرے طریقے کی طرف لوٹ جائیں گے۔ جناب عاکف سعید صاحب نے اس تحریر کا حوالہ دینے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ:

’’اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بہر حال یہ دو طریقے ہیں اور قیامِ پاکستان کے بعد جس طریقہ کار (یعنی انتخابات کے ذریعے نفاذِ شریعت) کو اختیار کیا گیا وہ وقتی طور پر تھا بایں طور کہ اگر کامیابی نہیں ملتی تو ہم پھر واپس پہلے طریقے (یعنی انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذِ شریعت) کی طرف جائیں گے۔‘‘

حیرت کی بات یہ ہے کہ سید مودودی مرحوم و مغفور غلبۂ اسلام کے جس طریقے کو اپنی تحریر میں بغیر کسی رنگ آمیزی کے دین کی خالص اور سادہ اصطلاح کی ترجمانی کرتے ہوئے ’’عمومی تحریک اصلاح‘‘ کے واضح عنوان سے ذکر فرما رہے ہیں جناب عاکف سعید صاحب سید مودودی مرحوم کی تحریر کے مندرجات درج کرنے کے باوجود اس دوسرے طریقے کو اس کا اصل نام دینے سے کتراتے ہیں اور مولانا مودودی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طریقے کو ’’انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعت‘‘ کے نام سے بدل دیتے ہیں۔‘‘

## جواب

صاحبِ مضمون کا اعتراض یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جس طریق کار کو ’’اصلاحی‘‘ کہا تھا جناب عاکف سعید صاحب نے اُسے ’’انقلابی‘‘ کے نام سے موسوم کر دیا۔ اِس اعتراض پر تبصرہ سے پہلے مناسب ہوگا کہ مولانا مودودیؒ کی وہ پوری تحریر نظر سے گزار لی جائے جس کے صرف ایک اقتباس کا حوالہ جناب عاکف سعید صاحب نے دیا ہے۔ دراصل مولانا مودودیؒ کی تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ اُن سے پوچھا گیا تھا کہ آپ اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تا کہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرایا جائے؟ مولانا یوں جواب دیتے ہیں:

’’ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو نہ اخلاق اسلامی ہوں‘ جہاں کا سیاسی و معاشی و تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی

کرتا رہا ہو' اور جہاں مجرد ایک سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یکا یک نوبت آگئی ہو۔ وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی بات پر اٹکا ہو کہ ہم دستور مرتب کر کے پیش کریں اور برسر اقتدار لوگ اسے لے کر نافذ کریں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ ایک مدرسے یا ایک بینک کو ہسپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہسپتال کا خاکہ مرتب کر دیں اور وہ مدرسے کے معلمین یا بینک کے اسٹاف کو دے دیا جائے تاکہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ شاید دستور کو انہوں نے کوئی تعویذ سمجھا ہے۔

واضح طور سمجھ لیجیے' یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے: ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے' اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہوں۔ (جنہیں ہم نے اپنے مطالبے میں بیان کر دیا ہے۔) پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے' پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں اور وہ حکومت کی طاقت و ذرائع سے کام لے کر پورے نظامِ زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریکِ اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے



معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا' لیکن خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہو گا جو قیامِ پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطہ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے' جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔''

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء' رسائل و مسائل زیر عنوان' قیام نظام اسلامی کی صحیح ترتیب)

تقسیم سے پہلے کا طریقہ' جسے مندرجہ بالا مضمون میں مولانا مودودیؒ نے 'دوسرا طریقہ' اور 'عمومی تحریکِ اصلاح' سے معنون کیا ہے' الفاظ کے پیرائے میں یوں بیان ہوا ہے: ''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریکِ اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے''۔ اِس طریقے کو جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے انقلابی طریقہ قرار دے کر صاحبِ مضمون کی رائے کے مطابق مولانا مودودیؒ کے موقف کی غلط تعبیر کی ہے۔ صاحبِ مضمون محمد رشید صاحب کے اس الزام کو پرکھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ مولاناؒ کی قبل از تقسیم کی تحریروں کی طرف رجوع کیا جائے جن میں اس ''دوسرے طریقے'' کی پوری تفصیلات موجود ہیں' جس کا ذکر مولاناؒ کے مذکورہ بالا اقتباس میں مختصراً صرف دو سطروں میں کیا گیا ہے۔ اور انہی دو سطروں کی بنیاد پر محمد رشید صاحب مولانا کے قبل از تقسیم طریق کار کو 'اصلاحی'' قرار دینے پر بضد ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودی قیامِ پاکستان سے قبل کی اپنی عمومی تحریکِ اصلاح کو **'انقلابی تحریک'** ہی سمجھتے تھے۔ اِس کے لیے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا سرسری سا جائزہ لینا ہی کافی ہے۔ مثلاً مولانا مودودی اپنی کتاب 'جماعت اسلامی کا مقصد' تاریخ' اور لائحہ عمل' اشاعت اوّل نومبر ۱۹۵۱ء' میں زیر عنوان 'متحدہ ہندوستان میں ہمارا موقف' قبل از تقسیم کی اپنی جدوجہد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''(متحدہ ہندوستان) میں انتخابات میں حصہ لینا ہمارے لیے شرعاً صحیح نہ تھا۔ اس لیے ہم نے اس زمانے میں پُرامن' غیر خفیہ' **انقلابی دعوت** کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔''

تبلیغی جماعت کے طریقہ تبلیغ اختیار کرنے کی تجویز کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں:

’’جس قسم کا **کُلی انقلاب** ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے وہ طریقہ کچھ بھی مددگار نہیں ہوسکتا۔‘‘ (روداد جماعت اسلامی‘ حصہ سوم‘ صفحہ ۱۶۲)

اسلامی حکومت کے قیام کے طریق کار کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا موقف پہلی بار ’’اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے‘‘ کے موضوع پر ان کی تقریر کے ذریعے ۱۹۳۹ء میں سامنے آتا ہے۔ اِس تحریر میں مولانا باقاعدہ **’اسلامی انقلاب کی سبیل‘** کی سرخی لگا کر اسلامی انقلاب کے منہج کو یوں واضح کرتے ہیں:

’’درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات‘ وہ مقصدِ زندگی‘ وہ معیارِ اخلاق‘ وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص سانچے کی انسانیت میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اسی مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ‘ مسلم فلسفی‘ مسلم مؤرخ‘ مسلم ماہرینِ مالیات و معاشیات‘ مسلم ماہرین قانون‘ مسلم ماہرین سیاست‘ غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں‘ جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں‘ اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (intellectual leadership) کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گردوپیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے عَلم بردار مصیبتیں اُٹھا کر‘ سختیاں جھیل کر‘ قربانیاں دے کر‘ مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ کامل المعیار (finest standard) سونا ہی پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے عَلم بردار بن کر وہ اٹھے ہیں۔ اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ ایسے بےلوث‘ بےغرض‘ راست باز‘ پاک سیرت‘



ایثار پیشہ‘ بااصول‘ خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اسی طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک میں کھنچ آئیں گے‘ پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے‘ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا‘ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی‘ اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائے گا‘ جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو۔ اور جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہوگا‘ اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کُل پرزے اس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔ یہ ہے اس **انقلاب** کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو **اسلامی انقلاب** اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔‘‘ (تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان‘ حصہ دوم‘ صفحہ ۱۷۰‘۱۷۱)

اب ملاحظہ فرمائیں وہ الفاظ جو امیر تنظیم اسلامی نے مولانا کے پیش کردہ طریقے کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں:

’’یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جو انقلابی راستہ تجویز کیا —— اپنے خطاب ’’اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے‘‘ میں بھی اور قیام پاکستان سے پہلے عملی نہج کے ذریعے بھی —— اس جدوجہد کے آخری مراحل کے خدوخال زیادہ واضح نہیں کیے تھے۔ انقلابی نہج کے ابتدائی مراحل وضاحت سے بیان فرمائے‘ یعنی قرآن کے ذریعے افراد کے قلوب میں حقیقی ایمان کی ترویج و آبیاری کرنا‘ افراد کے ذہن و قلب میں انقلاب برپا کرنا اور ایک مضبوط ڈسپلن والی جماعت تیار کرنا‘ لوگوں کے اندر دین کا جذبہ اور نفاذِ شریعت کی شدید پیاس اور تڑپ دل میں پیدا کرنا وغیرہ۔ ابتدائی طریقہ کار تو انہوں نے بڑی عمدگی سے بیان کیا لیکن آخری مراحل کو پورے طور پر واضح نہ کیا۔ اب یہ مصلحتاً بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس وقت ان کا ذہن پوری طرح واضح نہ ہو۔‘‘ (میثاق اکتوبر ۲۰۱۳ء‘ صفحہ ۳۲)

مولانا مودودیؒ کے الفاظ ’’اسلامی انقلاب کی سبیل‘‘ کو ’’انقلابی راستہ‘‘ کہنے اور ’’انقلاب کے ظہور کا فطری طریقہ‘‘ کو ’’انقلابی منہج‘‘ قرار دینے میں آخر عربی اردو کے علاوہ فرق ہی کیا

ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ زیر بحث اقتباس میں مولانا علیہ الرحمہ نے لفظ ''اصلاح'' ہی استعمال کیا ہے' البتہ دیکھنا یہ چاہیے کہ ان کے نزدیک اصلاح کا مفہوم کیا ہے؟ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ حافظ عاکف سعید صاحب کے انقلاب اور مولانا مودودیؒ کے تصورِ اصلاح میں کوئی مماثلت ہے یا نہیں؟ اور اگر مماثلت موجود ہو تو پھر مولانا کے لفظ اصلاح کو انقلاب سے تعبیر کرنے میں کوئی حرج باقی نہیں رہ جاتا۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ جماعت ان محدود معنوں میں کوئی سیاسی' مذہبی یا اصلاحی جماعت نہیں ہے جن میں عام طور پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں' بلکہ یہ وسیع معنوں میں ایک اصولی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور عالم گیر نظریہ حیات پر یقین رکھتی ہے اور اپنے اس نظریہ کو عقائد و افکار میں' اخلاق و عبادات میں' علوم و فنون' ادب و آرٹ میں' تمدن و تہذیب میں' مذہب و معاشرت میں' معاشی معاملات' سیاست اور نظامِ مملکت میں اور بین الاقوامی تعلقات اور روابط میں عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے۔'' (تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل' صفحہ ۴۰)

کچھ آگے بڑھ کر مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی انفرادی واجتماعی میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے۔'' (ایضاً' صفحہ ۴۳)

''مسلمان نام ہے ہی اس بین الاقوامی اصلاحی و انقلابی پارٹی کا نام جو اسلام کے نظریہ و مسلک کے مطابق انسانی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے اس میدان میں قدم رکھے۔''
(روداد جماعت اسلامی' حصہ چہارم' صفحہ ۳۴)

مولانا دین بیزار اقلیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''درحقیقت اقامت دین کی راہ کا روڑا یہی عنصر ہے۔ اس کو ہٹانا' عوام الناس کو اس کے اثر اور دباؤ سے نکالنا اور اقتدار کی مسندوں سے اس کو بے دخل کرنا ایک ایسا ناگریز تخریبی کام ہے جس کے بغیر کوئی تعمیری واصلاحی کام بار آور نہیں ہو سکتا۔''
(جماعت اسلامی کا مقصد' تاریخ' اور لائحہ عمل' صفحہ ۹۹)

اپنے پیش نظر کام کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''جو کام جماعت کے پیش نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظامِ زندگی کو بدلنا ہے' اسے دنیا کے اخلاق' سیاست' تمدن' معیشت' معاشرت ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا میں جو نظامِ حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اسے بدل کر



خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے۔ اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے۔'' (روداد جماعت اسلامی' حصہ اول' صفحہ ۱۶)

''اقامتِ دین میں 'دین' سے مراد اجزائے دین میں سے کوئی جزو نہیں ہے' خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو' بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے' اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی' عقائد بھی اور اعمال بھی۔'' (روداد جماعت اسلامی' حصہ سوم' صفحہ ۱۹۴)

''ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلابِ امامت ہے' یعنی دنیا میں ہم جس آخری منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اسی سعی و جہد کو ہم دنیا اور آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں...... دراصل فساق و فجار کی قیادت ہی نوعِ انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہو...... اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے' اضطراب کو امن سے' بد اخلاقیوں کو اخلاقِ صالحہ سے' اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہش مند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوعِ انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جا سکے۔'' (روداد جماعت اسلامی' حصہ سوم' صفحہ ۲۰۸' ۲۰۹ زیر عنوان: تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عقائد و اخلاق اور اعمال' معاشرہ و تمدن کے ساتھ ساتھ قانون اور حکومت کی اصلاح بھی مولانا کے منصوبے میں شامل ہے اور ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے لیے تبدیلیٔ قیادت بھی ناگزیر ہے۔ اور اس منصوبے کے لیے وہ انقلاب کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کئی تحریریں اور خطابات شاہد ہیں کہ اُن کے نزدیک اسلامی انقلاب صرف حکومتی ڈھانچے کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ ذاتی اور انفرادی زندگی میں انقلاب یا اصلاح بھی اُن کے پیش نظر ہے۔ نیز مولانا مودودی کی مندرجہ بالا عبارات سے تقابل کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ چاہے انقلاب کا استعمال ہو یا اصلاح کا' تصور دونوں خادمین دین کا ایک ہی ہے۔

## دوسرا اعتراض

جناب محمد رشید صاحب لفظ انقلاب کے استعمال پر ان الفاظ میں تنقید کرتے ہیں:

''واضح رہے کہ تحریک اصلاح کا عنوان توجہات کو انفرادی و اجتماعی اصلاح پر مرکوز کرانے پر زور دیتا ہے جبکہ ''انقلابی تحریک'' کا لفظ توجہات کو اصلاح کے اہم ترین فریضہ سے ہٹا کر باتوں کا تیس مار خاں اور مستقبل کے خیالی نقشے کی بحث و تمحیص میں گم کر دیتا ہے...... اصلاح کے لفظ سے عاجزی' انکساری' عبدیت اور انسانی ہمدردی و غمخواری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے جبکہ انقلاب کے لفظ سے ہی غرور' تکبر' نخوت' خون خرابہ' تباہی اور بربادی کے پیغام نشر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام عبدیت' تقویٰ اور اصلاح کا نعرہ بلند کیا کرتے تھے جبکہ جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے۔ چنانچہ دین کی دعوت دیتے ہوئے ''اصلاح'' کا لفظ استعمال کرنے میں ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس میں عاجزی' انکساری اور عبدیت کا اظہار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ ''انقلاب'' کے لفظ کی ادائیگی ہی سے ہمارے لہجوں میں سختی' رعونت' رعب اور فخر پیدا ہو جاتا ہے۔''

## جواب

ہمارے نزدیک اختلافِ تسمیہ کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے جبکہ علماء کا اصول **لا مشاحۃ فی الاصطلاح** معروف ہے' اور یہ اختلاف ذوقِ لطیف کے لیے ضروری بھی ہے۔ آخر پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا بھی ایک خاص مزہ ہے۔ یہی وجہ ہے لفظ اصلاح مولانا مودودیؒ کی ایک ہی مستقل اصطلاح نہیں ہے۔ مولانا کے تخلیق کردہ ادب کا ہر قاری جانتا ہے کہ مولانا نے اسلام کے غلبے کے لیے کئی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ان میں سے اہم اصطلاحات ہیں: خلافتِ الٰہیہ' حکومتِ الٰہیہ' خدائی بادشاہت' نظامِ اسلامی' اعلائے کلمۃ الحق' اعلائے کلمۃ اللہ' تجدیدِ دین' احیائے دین' اسلامی انقلاب' اسلامی تحریک' اقامتِ دین' شہادتِ حق' تحریکِ اسلامی' اصلاح' انقلابِ امامت' اصلاحی انقلاب وغیرہ۔ مولانا نے اپنے مضمون ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے'' میں اصلاح کا لفظ ایک آدھ بار جب کہ انقلاب کا لفظ ایک درجن سے زائد بار استعمال کیا ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے: تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان' حصہ دوم' زیر عنوان: اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے' صفحہ ۱۶۱ تا ۱۹۰۔) اب کیا جناب رشید صاحب اپنے الفاظ کی لاج رکھتے ہوئے کہ ''جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے'' مولانا مودودیؒ کی ذاتِ گرامی پر ان ناپسندیدہ القاب کی تہمت لگانے کی جسارت کریں گے؟

تنظیم اسلامی بھی غلبۂ دین کے لیے صرف انقلاب کی اصطلاح استعمال نہیں کرتی۔



بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے اپنے ایک اہم مضمون 'اسلامی انقلاب' معنی و مفہوم اور اس کے لیے قرآنی و دیگر اصطلاحات' (شائع شدہ 'نوائے وقت و میثاق نومبر ۱۹۹۲ء) میں اضافی طور پر' تکبیرِ رب' غلبۂ دینِ حق اظہارِ دینِ حق (ماخوذ از التوبہ: ۳۳) دین کا بالکلیہ اللہ کے لیے ہو جانا (ماخوذ از الانفال: ۳۹)' قیامِ عدل و قسط (ماخوذ از الحدید: ۲۵) وغیرہ بھی بیان کی ہیں۔

مولانا مودودیؒ اپنی ایک تحریر میں تین اصطلاحات: اقامتِ دین' شہادت علی الناس اور تحریکِ اسلامی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''پہلے دو لفظ قرآن سے ماخوذ ہیں اور تیسرا لفظ عام فہم ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ پر اگر کسی نے ناک بھوں چڑھائی ہے تو اس لیے کہ انہوں نے ہماری اصطلاح سے اپنا مفہوم مراد لے لیا ہے' ہمارا مفہوم مراد لیتے تو امید نہ تھی اس پر ناراض ہوتے۔'' (جماعتِ اسلامی کا مقصد' تاریخ اور لائحہ عمل' صفحہ ۸)

بالکل اسی طرح ہم لفظ انقلاب کو آسان فہم ہونے کے سبب استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ دینی فرائض اور اِن کے لوازم کے تحت لکھتے ہیں:

''اس ضمن میں تین باتیں تو بنیادی و اساسی ہیں اور تین ہی ان کے لوازم ہیں۔ یہ کُل چھ باتیں ہوں گی۔ تین بنیادی و اساسی باتوں کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ ابتداءً بھاری بھرکم اصطلاحات سے ہٹ کر ان کو عام فہم انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ہر علم اور ہر فن کا اصل اور حقیقی فہم انہی اصطلاحات کے حوالے سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ فزکس نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کی گرفت میں اس کی بنیادی اصطلاحات' (basic terminologies) نہ آ جائیں۔ اسی طرح ہمارے دین کی بھی اصطلاحات ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ پہلے ان اصطلاحات سے ذرا ہٹ کر بات اصولاً سمجھ لی جائے۔

ان تین بنیادی و اساسی باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود دین پر عمل پیرا ہوں' اس پر کاربند ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ہم دین کو پھیلائیں۔ اور تیسری یہ کہ ہم دین کو قائم کریں۔ یہ ہیں تین بنیادی و اساسی باتیں۔''

(دینی فرائض کا جامع تصور' مطبوعہ مکتبہ خدام القرآن لاہور' صفحہ ۹)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے دینی فرائض کو آسان اصطلاحات میں بیان کرنے کے بعد ہر ایک کے لیے قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ ایک سے زیادہ دینی اصطلاحات استعمال کر کے بات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اللہ جانے ہم نے دین کی کتنی عظیم اصطلاحات کو بدنام کر چھوڑا ہے۔ لیکن اس وجہ سے ہم دین کی کسی بھی اصطلاح کو اِن شاء اللہ ترک نہیں کریں گے' بلکہ ان میں اصل روح پھونکنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔'' (دینی فرائض کا جامع تصور' صفحہ ۳۷)

اب اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے دینی اصطلاحات کو ترک کبھی نہیں کیا بلکہ ابتدائی مرحلے میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے بھاری اصطلاحات سے قطع نظر کرتے ہوئے آسان یا رائج اصطلاحات میں بات کی ہے اور پھر اصل اصطلاحات کے حوالے سے بھی بات کی ہے۔ مثلاً انقلاب ہی کو لیں جسے ہم اسلامی حکومت یا قیامِ نظامِ اسلامی کے لیے استعمال کرتے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ' دیگر دینی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں جن کا ذکر قبل ازیں ہو چکا۔

صاحبِ مضمون کی تحریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انبیائے کرامؑ عبدیت' تقویٰ اور اصلاح کا نعرہ بلند کرتے تھے' جبکہ انقلاب کی اصطلاح کا استعمال طریق انبیائے کرامؑ کے برعکس کوئی چیز ہے۔ جہاں تک عبدیت اور تقویٰ کی اصطلاحات کی بات ہے تو ہمیں یقین ہے کہ موصوف کی نظر سے تنظیم اسلامی کے دعوتی و تربیتی لٹریچر کا ایک ابتدائی قاعدہ ''دینی فرائض کا جامع تصور'' ضرور گزرا ہوگا۔ وہ اِس میں عبدیت اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ کم از کم دس مزید اصطلاحات بھی موجود پائیں گے جن کے ذریعے دعوتِ اسلامی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور جو قرآن وحدیث کی نصوص سے منصوص کی گئی ہیں۔ البتہ قرآن پاک میں اصلاح کا لفظ حضرت شعیب علیہ السلام کے قول کے طور پر (الاعراف: ۸۵ اور ہود ۸۸) جبکہ ایک مقام (الاعراف: ۵۶) پر خطابِ الٰہی کے طور پر نقل ہوا ہے۔ البتہ نبی اکرم ﷺ کے لیے یا کسی اور نبی کے لیے یہ لفظ استعمال ہی نہیں ہوا۔ اُمتِ محمدیؐ سے خطاب کے ضمن میں اِس مصدر کے بہت سارے مشتقات ضرور استعمال ہوئے ہیں لیکن ان میں سے کسی جگہ بھی اجتماعی اصلاح' انقلاب' یا اسلامی حکومت یا قانون کے قیام و نفاذ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ کئی جگہ تو یہ لفظ کسی شخص کی توبہ کے بعد پرہیز گاری اور کئی جگہ مخالف فریقین کے مابین صلح کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے علم کی حد تک نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں یہ لفظ اپنے لیے استعمال نہیں فرمایا۔ اب سوچا جا سکتا ہے کہ جب قرآن میں یہ لفظ صرف ایک نبیؑ کے لیے استعمال ہوا ہے تو اس کے استعمال پر اصرارِ شدید اور ترک پر اعتراضِ زجر و توبیخ کتنا مناسب ہے؟ پھر ہمارے دین میں کئی اصطلاحات ایسی ہیں جو دورِ نبوی ﷺ میں موجود نہ تھیں لیکن بعد کے علماء نے عصری علمی ضروریات کے تحت انہیں رائج کیا۔ بطورِ مثال سُنّتِ مؤکدہ' مکروہ تنزیہی' مکروہ تحریمی وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔



الحمد للہ! اصلاح کے لفظ کو استعمال کرنے پر ہمیں نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ ہی اِس پر ہم کوئی شرم محسوس کرتے ہیں' بلکہ چونکہ قرآن حکیم میں ایک جلیل القدر نبیؑ سے اس لفظ کا استعمال ثابت ہے' لہٰذا دیگر اصطلاحات کے ساتھ ''اصلاح'' کو ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ رائج الوقت اردو محاورے میں اس لفظ کا غالب استعمال انفرادی اصلاح کے لیے رائج ہے۔ لہٰذا ہمیں اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے اس کے ساتھ انفرادی یا اجتماعی کا سابقہ لگانا چاہیے یعنی انفرادی اور اجتماعی اصلاح۔ اس لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کرنے کے باوجود مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آیا ہے تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور پھر ہر نشتر اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ اب آپ لوگ اس مذاق کو یکسر بدل ڈالیے۔''

(ہماری تبلیغی پالیسی' روداد جماعت اسلامی' حصہ دوم' صفحہ ۷۳)

جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ لفظ اصلاح میں عاجزی' انکساری اور عبدیت کا اظہار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ ''انقلاب'' کے لفظ کی ادائیگی ہی سے ہمارے لہجوں میں سختی' رعونت' رعب اور فخر پیدا ہو جاتا ہے۔ غور فرمایئے بعض دفعہ اچھے ناموں کی پشت پر برے تصورات بھی پائے جاتے ہیں' مثلاً دورِ نبوی ﷺ میں منافقین اصلاح کا لفظ استعمال کر کے فساد مچایا کرتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴾ (البقرۃ)۔ جدید دنیا میں رونما ہونے والا اکثر فساد' بعنوان اصلاح یا دیگر اچھے الفاظ ہی سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ یورپ کی تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) اس کی نمایاں مثال ہے۔ عصرِ حاضر کے بعض متجددین اور ماضی قریب کے بعض مناظرین' تجدید و اجتہاد کے نام پر دین کی جو درگت بنانے کی سعی نامراد کر چکے ہیں وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ لہٰذا اہمیت صرف اصطلاح کی نہیں بلکہ پس پردہ اور پیشِ نظر مقاصد کی بھی ہے۔ اگر اصلاح کا لفظ استعمال کرنے والے انفرادی تربیت و تزکیہ کے ساتھ ساتھ نظامِ حکومت' کاروباری اداروں' معاشی سرگرمیوں' عائلی قوانین' فوجداری قوانین کی اصلاح بھی چاہتے ہیں تو ہمارے نزدیک لفظ اصلاح کا استعمال محمود ہے اور ہم اسے ہی انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں۔

## تیسرا اعتراض

جناب محمد رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''تنظیم کے ابتدائی تشخیصی اور بنیادی موقف اور اعلانیہ پروگرام سے متضاد یہ وہ اعلان ہے جسے تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے پیہم اصرار اور تکرار سے بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی سید مودودی مرحوم ومغفور نے احیائے اسلام کے لیے جس ''عمومی تحریک اصلاح'' کا ذکر کیا ہے وہ نام نہاد ''انقلابی جدوجہد'' کا ابتدائی مرحلہ ہے' جبکہ اس مجہول الاسم ''انقلابی جدوجہد'' کا تکمیلی مرحلہ وہ ہے جسے جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے مِنہجِ نبوی ﷺ اور سیرتِ نبوی ﷺ کے اہم مرحلہ ''قتال فی سبیل اللہ'' میں اجتہاد کرتے ہوئے پُرامن احتجاجی تحریک کو ''غیر مسلح تصادم'' کے عنوان سے شدومد اور نہایت تکرار واصرار سے قبول کرانے کی دعوت دی۔''

## جواب

امیر تنظیم اسلامی نے مولانا کی تحریک کو انقلابی کہا ہے' جیسا کہ مولانا مودودیؒ کے الفاظ سے یہ بارہا ظاہر ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی محض فرد کی اصلاح کے لیے قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر دین حق کا غلبہ وقیام اول دن سے اس کا مشن تھا۔ نظام کی اس تبدیلی کے لیے قرآن کی اصطلاح ''اقامتِ دین'' اور ''اظہارِ دینِ الحق علی الدّین کُلّہ'' ہے' جب کہ آج کی اصطلاح میں اس تبدیلی کو انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ مشن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہی انقلابی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنے کام کے ابتدائی مراحل کے لیے بھی جابجا 'انقلاب' کے لفظ کو استعمال کیا جس سے ان کے کام کا رخ بجا طور پر واضح ہوتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ تنظیم اسلامی احتجاجی سیاست کے لیے مولانا مودودی سے دلیل نہ پکڑتی ہے نہ ان پر احتجاجی طریقہ ترک کرنے کا الزام دھرتی ہے۔ تنظیم اسلامی نے احتجاجی تحریک کا طریقہ خود 'ایجاد' کیا ہے۔ تنظیم کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ مِنہجِ انقلابِ نبوی ﷺ کے آخری مرحلے ''مسلح تصادم'' کا متبادل ہے۔ آپ احتجاجی سیاست حتیٰ کہ ہمارے پیش کردہ مِنہجِ انقلابِ نبوی ﷺ سے بھی اختلاف رکھ سکتے ہیں کہ یہ طریقہ منصوص نہیں ماخوذ ہے' یعنی یہ طریقہ قرآن و سنت کی نصوص میں حرف بحرف اس طرح لکھا نہیں ہے جیسے ہم بیان کرتے ہیں' بلکہ ہم نے قرآن وسنت کی نصوص' سیرتِ نبویؐ وصحابہؓ اور مزاجِ اسلامی سے اخذ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ استنباط واستشہاد میں غلطی کا امکان بہرحال موجود رہتا ہے اور اس غلطی پر تنقید کرنا اہلِ علم کا حق ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم یہ تنقید ٹھنڈے دل سے سنیں' سمجھیں اور اگر محسوس ہو کہ واقعتاً ہم سے کسی قسم کی غلطی ہوئی ہے تو اس کی اصلاح کریں۔ بصورتِ دیگر ہم اس تنقید پر اپنی وضاحت پیش



کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ حافظ عاکف سعید صاحب نے اپنے زیر بحث خطاب میں فرمایا:

''ابتدائی طریقہ کار تو انہوں نے بڑی عمدگی سے بیان کیا لیکن آخری مراحل کو پورے طور پر واضح نہ کیا۔ اب یہ مصلحتاً بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت ان کا ذہن پوری طرح واضح نہ ہو۔''

امیر تنظیم' مولانا کے اس طریقے کے بارے میں کہتے ہیں کہ آخری مرحلہ ان کے ہاں واضح نہیں ہے تو یہ مولانا کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے۔ مولانا خود اپنی تحریروں میں بار بار لکھتے ہیں کہ ایک لازمی اور طبعی نتیجے کے طور پر وہی نظام قائم ہو جائے گا جس کے لیے زمین تیار کی گئی ہوگی۔ نیا نظامِ حکومت تشکیل دینے کے لیے ضروری ہے کہ ''اصلاح پسند'' حکومت میں آئیں یا مولانا کے الفاظ میں انقلابِ قیادت واقع ہو۔ اس کے بغیر نظام کیسے قائم ہوگا؟ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی دعوت کے نتیجے میں عوام الناس اپنی اسلامی نظام کی پیاس کو کیسے ظاہر کریں گے اور پہلے سے قائم شدہ نظام کے محافظ کیسے اندازہ کریں گے کہ ان کا نظام چلنا مشکل ہوگیا ہے یا انقلابی لوگ ان حاکموں کو یہ حقیقت کس طریقے سے باور کرائیں گے؟ اور یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکمران اس راز کو پا ہی جائیں تو کیا اتنے حقیقت شناس واقع ہوں گے کہ کرسی چھوڑ کر صالح قیادت کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دے دیں؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں نہ پا کر ہم کہتے ہیں کہ آخری مرحلے کے خدوخال انہوں نے واضح نہ فرمائے تھے۔ لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ طبعی نتیجے کے طور پر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔

اسلامی انقلاب کے طریقے سے بحث کرنے والا مولانا مودودی کا ایک اہم مضمون ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' ہے۔ دراصل یہ اپریل ۱۹۴۵ء میں جماعت کے سالانہ اجتماع سے آپ کا خطاب ہے' اس میں مولانا فرماتے ہیں:

''اسی طرح نظامِ امامت کا وہ انقلاب بھی جو آپ کی پیش نظر ہے' کبھی محض دعاؤں اور تمناؤں سے رونما نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں جن کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے۔'' (روداد جماعت اسلامی' حصہ سوم' ص ۲۱۶' زیرعنوان: تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

''نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک (صالح) گروہ کے محض وجود میں آ جانے ہی سے نظامِ امامت میں تغیّر واقع نہ ہو جائے گا کہ اِدھر وہ بنے اور اُدھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فُسّاق و فُجّار کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انہیں مسند نشین

کر دیں۔'' (ایضاً' ص ۲۲۷)

''تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' سے بظاہر یہ شک پڑتا ہے کہ اس میں اخلاقِ عالیہ کی تلقین کے ساتھ خوشخبری ہو گی کہ بس حکومت کا ہما آپ کے سر پر منڈلا ہی رہا ہے' لیکن مولانا اخلاقیات کی عمدہ تعلیم و توجیہہ کے ساتھ دوسرا رخ بھی دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مجموعی طور پر انسان کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز نہ تو مادی قوت ہی سے ہوسکتا ہے اور نہ ہی اخلاقی قوت سے' اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں یا وہ ان میں دوسروں کی نسبت کمزور ہوتا ہے اگر چہ اصلی فیصلہ کن اہمیت پھر بھی اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی طاقت کی۔'' (ایضاً' ص ۲۱۸)

آگے مولانا رقم فرماتے ہیں:

''لیکن اگر کوئی ایسا منظم گروہ موجود ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتاہی نہ کرے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قائم رہ سکے۔'' (ایضاً)

یہاں تک یہ واضح ہو چکا ہے کہ مولانا کے ہاں بھی انقلابِ قیادت ایک طبعی نتیجہ پر ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے اخلاقی طاقت کے ساتھ ساتھ' مادی طاقت سے کام بھی لینا پڑے گا اور یہ غلبہ معجزانہ انداز سے بھی نہ ہوگا بلکہ عادی قوانین ہی کے تحت ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ عادی قوانین کے تحت مادی قوت کے استعمال کا طریقہ کیا ہوگا اور اس کے مراحل و لوازم کیا ہوں گے؟ ہمارے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ مولانا جیسے مدبر اور پیش بند شخص نے یا ان کے ساتھیوں نے اس مسئلے پر کبھی سوچا نہ ہو۔ وہاں نہ صرف یہ کہ سوچا جاتا تھا بلکہ پوچھا بھی جاتا تھا۔ ایسے سائلین کا ذکر مولانا اپنے الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

''اس دور میں سب سے زیادہ جو سوال سوچنے سمجھنے والے طبقے کو پریشان کرتا تھا وہ یہ تھا کہ...... وہ انقلاب کیسے قائم ہوگا جو ہم برپا کرنا چاہتے ہیں؟ فرض کیجیے ہم غالب حصہ آبادی کے خیالات' ذہنیتیں' اخلاقی معیارات' سب کچھ بدل دیتے ہیں تب بھی کفر کا اقتدار خود بخود تو ختم نہ ہوگا۔ اسے بدلنے کے لیے بہرحال کوئی عملی صورت ہی اختیار کرنا ہوگی......'' (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۰۵)



تقسیم ہند سے پہلے مولانا مختلف بلکہ مختصر انداز سے اس مسئلے کی طرف روشنی ڈالتے رہے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو ایک ترتیب سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''بلکہ اس جماعت کو کفر و فسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں' ہر ہر قدم پر کشمکش اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامتِ حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبتِ حق اور اپنی اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاءؑ تک مستثنیٰ نہ رکھے گئے' کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنیٰ رہے گا۔''

(روداد جماعت اسلامی' سوم' ص ۲۲۷' زیر عنوان: تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

''تمام اہل خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں اجتماعی قوت پیدا کریں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظامِ حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی کا منصب مؤمنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو''۔ (ایضاً' ص ۲۱۳)

''اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو اصلاح سے' اضطراب کو امن سے' بداخلاقیوں کو اخلاقِ صالحہ سے' اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہش مند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوعِ انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جا سکے۔'' (ایضاً' ص ۲۰۸' ۲۰۹)

''ہمیں ایک عوامی تحریک چلانے سے پہلے ایسے آدمی تیار کرنے کی فکر ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں...... ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیش نظر کام کا جو نقشہ ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں...... ایک ٹھوس' پائیدار' اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔'' (جماعت اسلامی کا مقصد' تاریخ' اور لائحہ عمل' صفحہ ۴۳' ۴۴)

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے ایک تحریک بہرحال مولانا کے ذہن میں موجود تھی۔ اب اس تحریک کے مراحل کیا ہوں گے' اس کا بھی ایک خاکہ لازماً' مولانا اور جماعت کی قیادت کے ذہنوں میں بہرحال موجود تھا' ملاحظہ فرمائیں:

''اس دوران منفرد اشخاص کو بھی اور پورے گروہ کو بھی بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا اور کئی رکاوٹیں پیش آئیں گی جن سے ہر مرحلے کے حالات کے مطابق نمٹنا ہو گا۔ ان کی تفصیل نہ اس وقت بتائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔'' (تقریر میاں محمد طفیلؒ اجتماع الٰہ آباد' اپریل ۱۹۴۶ء' روداد جماعت اسلامی' حصہ چہارم' صفحہ ۳۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کے اگلے کچھ مراحل ان کے ذہن میں موجود تھے لیکن وہ اس وقت ان کی اشاعت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اسی سے رشید صاحب کا یہ اعتراض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ تنظیم اسلامی تحریک اصلاح کو نام نہاد ''انقلابی جدوجہد'' کے محض ابتدائی مرحلے میں مقید کرتی ہے' حالانکہ یہ خود اہل جماعت کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

بلاشبہ یہ سعادت ڈاکٹر اسرار احمد کے حصے میں آئی کہ سیرت النبی ﷺ کے گہرے مطالعے کے بعد انہوں نے ایک مربوط منہج انقلاب پیش کیا۔ بلاشبہ آپ کی کتاب ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' اِس موضوع پر ایک جامع کتاب ہے۔ آپ نے بیان فرمایا کہ تحریک کے ابتدائی مراحل' دعوت' تربیت' تنظیم اور صبرِ محض تو نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق ہی طے کیے جائیں گے۔ اس دوران دعوت وتبلیغ' تربیت وتنظیم اور اس کے ساتھ امر بالمعروف اور خصوصاً نہی عن المنکر باللسان میں مشغول رہا جائے۔ بعد کے مراحل میں نبی اکرم ﷺ نے تو مسلح جنگ کا راستہ اختیار کیا تھا' لیکن چونکہ ہم جس معاشرے میں کام کر رہے ہیں اس میں مسلمان ہی مدمقابل ہیں لہٰذا یہاں پر جنگ کے بجائے نہی عن المنکر بالید کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آپ اس کے لیے حدیث مبارکہ پیش کرتے ہیں کہ:

''تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے' اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے بدلنے کی کوشش کرے' اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے بدلنے کی کوشش کرے' اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔'' ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس حدیثِ مبارکہ کے اسلوب پر غور وتدبر سے یہ لازمی تقاضا سامنے آتا ہے کہ منکر کو مٹانا' اسے برا کہنا اور اسے برا سمجھ کر اس سے نفرت کرنا ہر مسلمان پر واجب اور فرض ہے۔ سب سے نچلے درجے پر ہرگز قانع نہیں ہونا چاہیے' بلکہ لازم ہے کہ طاقت حاصل کرنے اور جمعیت فراہم کرنے کے لیے دل وجان سے کوشش کی جائے۔ لوگوں کو تیار کیا جائے کہ منکرات کو مٹانے اور بدلنے کے لیے اپنی جانیں تک دینے کے لیے آمادہ ہوں۔ جب تک طاقت حاصل نہ ہو زبان سے بھی منکر کو منکر کہنے کا عمل جاری رہے۔ صاحبانِ اقتدار کو نرم وگرم طور پر اس طرف متوجہ کیا



جاتا رہے۔ اس دوران دل میں منکرات کے خلاف نفرت پروان چڑھتی رہے تاکہ جب ان کو طاقت وقوت کے ساتھ بدلنے کا مرحلہ آئے تو جذبات میں منکرات کے خلاف جوش وخروش کا طوفان موجزن ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مسلمان ماحول کے رنگ میں رنگا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دل کی نفرت کم ہو اور پھر ماحول اس پر چھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کل وہ جس کام کو برا کہہ رہا تھا اور برا سمجھ رہا تھا آج وہ خود اس میں ملوث ہو جائے۔'' (منہج انقلابِ نبوی' ص ۳۵۴)

احتجاجی طریق کار کی تائید دیگر علماء کرام بھی کرتے ہیں۔ علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں:

''منکر کو روکنے کی تیسری شرط اسے روکنے کی طاقت رکھنا ہے' گویا منکر کو روکنے والا ذاتی طور پر یا اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر بالفعل یہ طاقت رکھتا ہو کہ منکر کو قوت کے ساتھ روک سکے...... منکر کو روکنے کے مسئلے میں ایک مشکل اس وقت کھڑی ہو جاتی ہے جب صاحب قوت واختیار یعنی حکومت ہی برائی کی مرتکب ہو تو پھر افراد اور جماعتیں اس منکر کو کیسے روکیں جس میں حکومت ملوث ہو رہی ہو یا پشت پناہی کر رہی ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے افراد اور جماعتیں اتنی قوت کی مالک بنیں جو برائی کو روک سکے۔'' (شائع شدہ میثاق' مئی ۲۰۱۳ء)

علامہ یوسف القرضاوی مزید لکھتے ہیں:

''عوام کی ملکی سطح کی ایسی فیصلہ کن قوت ہوتی ہے جسے اجتماع سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جب یہ قوت حرکت میں آ جائے تو کسی میں ہمت نہیں ہوتی کہ اس کا سامنا کرے یا اس کا راستہ روکے۔ یہ قوت اپنی تندی اور تیزی میں ٹھاٹھیں مارتے سمندر یا سب کچھ بہالے جانے والے سیلاب کی مانند ہوتی ہے کہ کوئی شے' حتیٰ کہ مسلح قوتیں بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔ یہ مسلح قوتیں بھی تو اسی کا حصہ ہوتی ہیں اور یہ عوام ان قوتوں کے افرادِ خاندان' باپ' بیٹے اور بھائی ہی تو ہوتے ہیں۔'' (ایضاً)

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے مضمون ''حکومت کی معزولی'' (شائع شدہ میثاق' دسمبر ۲۰۱۳ء) میں ''شرعی ہڑتال'' کے دلچسپ نام سے سول نافرمانی پر عمدہ کلام فرمایا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں:

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شریعت میں حکومت پر دباؤ ڈالنے کا اور کوئی طریقہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ حقیقت میں شریعت نے ایک راستہ ایسا تجویز کیا ہے کہ اگر قوم اس پر عمل کر لے تو بڑی سے بڑی جابر حکومتوں کے گھٹنے چند گھنٹوں میں ٹکوائے جا سکتے ہیں اور وہ راستہ یہ ہے کہ اس اصول پر عمل کیا جائے کہ: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) (الجامع الصغیر للسیوطی' ح: ۹۹۰۳' عن عمران بن الحصین)

"خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔"

جب ایک مرتبہ یہ اصول مان لیا جائے کہ کسی مخلوق کے حکم پر خالق کی نافرمانی نہیں کی جاسکتی تو جتنے غیر اسلامی احکام نافذ ہیں' ساری قوم اگر ان میں شرکت سے انکار کردے تو اندازہ کیجیے کہ حکومت کے پاس کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے؟ فرض کیجیے کہ عدالتوں میں بیٹھنے والے جج اگر یہ کہہ دیں کہ جب تک ہمیں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا اُس وقت تک ہم عدالتوں میں کام نہیں کریں گے اور وکلاء یہ کہہ دیں کہ جب تک قوانین شریعت کے مطابق نہیں ہو جاتے ہم عدالتوں میں بحیثیت وکیل کے پیش نہیں ہوں گے' اگر بینک کے ذمہ دار اور بینک کے ملازمین یہ کہہ دیں کہ جب تک بینکاری کا نظام سود سے پاک نہیں ہوجاتا ہم بینکوں میں کام نہیں کریں گے' اور اگر عوام یہ کہہ دیں کہ جب تک بینکوں کا نظام سود سے پاک نہیں ہوجاتا اُس وقت تک ہم بینکوں میں پیسے نہیں رکھوائیں گے' اور تاجر یہ کہہ دیں کہ جب تک بینک سود سے پاک نہیں ہوجاتا اُس وقت تک ہم اس سے تمویلی معاملات نہیں کریں گے۔ اگر "لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ" کی بنیاد پر' جو ان کی شرعی ذمہ داری ہے' سارے عوام مل کر غیر شرعی احکام کی تعمیل سے انکار کر دیں تو آپ ذرا تصور کریں کہ جس دن یہ ہڑتال ہوگی' اُس دن چند گھنٹوں میں حکومت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ شرعی ہڑتال ہے۔"

پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف لکھتے ہیں:

"دورِ حاضر میں کسی بھی مسئلے کے بارے میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے اور مخالف قوتوں سے اظہارِ ناراضگی کرنے کے اور حکومت کے خلاف سیاسی و جمہوری جدوجہد کرنے کے طریقے جلسے' جلوس اور ہڑتال وغیرہ ہی ہیں۔ اس لیے اکثر علماء کے نزدیک ان ذرائع کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بہت سے اسلامی ملکوں میں بھی جن میں پاکستان' ایران' ترکی' انڈونیشیا' ملائیشیا' اور بہت سے دوسرے کئی ممالک شامل ہیں' لوگ اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے یہی طریقے اختیار کرتے ہیں۔"

(پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف' ششماہی منہاج' لاہور' جنوری تا جون ۲۰۰۵' صفحہ ۶۲)

## چوتھا اعتراض

محمد رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ طریق کار کے چوائس کے ضمن میں جو حق اور آزادی آپ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ کس اتھارٹی اور دلیل کی بنیاد پر دوسروں سے اپنی رائے سے



مختلف طریق کار اختیار کرنے پر ان سے چوائس کا حق چھین لینا چاہتے ہیں؟ کیا "احتجاجی سیاست" آسمان سے اُترا ہوا کوئی صحیفہ ہے جس کو مضبوطی سے تھام لینے کی صبح شام آپ دعوت دیے چلے جا رہے ہیں؟ اور کیا "انتخابی سیاست" قرآن وسنت کی کسی بھی نص سے "کارِ حرام" ثابت ہوتا ہے جسے آپ دینی جماعتوں کے لیے شجرِ ممنوعہ ثابت کرنے میں عقل ومنطق کی کوئی دلیل بھی رائیگاں نہیں جانے دیتے؟"

## جواب

فاضل مضمون نگار کے لب ولہجے کی تلخی اور کڑواہٹ ہمارے لیے ناقابل فہم ہے' بالخصوص اس تناظر میں کہ وہ "اصلاح" کے اس تصور کے علم بردار ہیں جو عاجزی' انکساری اور عبدیت اور انسانی ہمدردی وغم خواری سے عبارت ہے' تاہم ان کے اس لب ولہجے پر کوئی تبصرہ کیے بغیر ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ ان کا ہم پر یہ اعتراض درست نہیں کہ ہم دوسروں کو طریق کار کی چوائس کا حق نہیں دیتے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم نے کبھی یہ حق چھینا ہی نہیں۔ میثاق کی اسی تحریر میں جس پر جناب نے تبصرہ فرمایا ہے' امیر تنظیم اسلامی کے یہ الفاظ موجود ہیں" میں یہ اعتراف کروں گا کہ بدلے ہوئے حالات میں کسی نئے طریقے پر غور کرنا بالکل قابل فہم ہے اور عقل و دانش اسے تسلیم کرتی ہے" (میثاق' اکتوبر ۲۰۱۳' صفحہ ۳۲)۔ غور فرمائیے کہ ان الفاظ سے دوسروں کو طریق کار کی چوائس کا حق دیا جارہا ہے یا چھینا جارہا ہے؟ ہماری اس بات کی دلیل ہمارا یہ رویہ بھی ہے کہ ہم نے دوسرے طریقے حتیٰ کہ الیکشن تک کو کبھی حرام نہیں کہا۔ نہ اس طریقے کے عاملین کو ضال ومضل قرار دیا ہے اور نہ ہی اُن کے اخلاص پر شبہ کیا ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ہمارا موقف معروف ہے لیکن ہم پیش کیے دیتے ہیں۔ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

(i) ہمارے نزدیک تاریخ انسانی میں آج تک کوئی انقلاب انتخابات کے ذریعے نہیں آیا۔ (واضح رہے کہ انقلاب سے مراد Politico Socio Economic System میں کوئی بنیادی تبدیلی ہے) یہ بات تاریخی طور پر طے شدہ ہے۔

(ii) ہمارے نزدیک الیکشن پہلے سے قائم کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتے ہیں' کسی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے نہیں۔ امریکہ میں دونوں انتخابی حریف یعنی Democrats اور Republicans امریکہ میں قائم نظام پر متفق ہیں۔ ان کے مابین فرق صرف پالیسی سے متعلق بعض معاملات میں ہے۔

(iii) الیکشن خواہ کتنے ہی صاف وشفاف اور غیر جانبدارانہ ومنصفانہ کیوں نہ ہوں'

معاشرے میں موجود جو بھی اقتصادی (Power bases) ہوں گے یا بالفاظ دیگر معاشی واقتصادی ڈھانچے پر جن طبقات کا تسلط ہوگا' ان انتخابات کے نتائج میں انہی کی reflection (عکاسی) ہو گی۔ اگر وہاں جاگیرداری نظام قائم ہے تو کوئی جاگیردار ہی انتخابات کے ذریعے اوپر آئے گا۔ اسّی پچاسی فیصد نشستوں پر وہی قابض ہوں گے' باقی پندرہ بیس فیصد محض ڈگڈگی بجاتے رہ جائیں گے۔

مذکورہ بالا تین نکات سے ہم جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ یہ ہے کہ نظامِ اسلام کے قیام کے لیے الیکشن میں حصہ لینا "Exercise in futility" کے سوا کچھ نہیں ہے' یہ محض قوت اور وقت کا ضیاع ہے۔ تاہم الیکشن کے بارے میں اپنے اس موقف کا بھی میں ہمیشہ اظہار کرتا رہا ہوں کہ یہ حرام نہیں ہیں۔ میں نے مولانا صوفی محمد صاحب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کئی بار کیا ہے جو مالاکنڈ کی تحریک نفاذِ شریعت کے قائد ہیں۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ الیکشن میں ووٹ دینا بھی حرام ہے اور الیکشن لڑنا بھی حرام ہے۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا تھا۔ دیر کے ایک دور دراز علاقے میں ''میدان'' نام کا ایک مقام ہے' جہاں صوفی صاحب رہائش پذیر تھے۔ میں ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا میں اس حد تک آپ سے متفق ہوں کہ الیکشن کا اس لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے سے دین نہیں آ سکتا' لیکن آپ اس کو حرام کہہ رہے ہیں تو اس کے لیے کوئی وزنی دلیل درکار ہے۔ اس کے لیے آپ کو علماء کے سامنے اپنے دلائل پیش کر کے ان کا اتفاقِ رائے حاصل کرنا چاہیے۔ میں بہرحال اسے حرام نہیں کہہ سکتا اور میں نے کبھی بھی اس کو حرام قرار نہیں دیا۔

دوسرے' میں یہ بھی ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ جو لوگ خلوص واخلاص کے ساتھ قائل ہیں کہ اس ذریعے سے یہاں واقعتاً کوئی تبدیلی آ سکتی ہے' اسلامی نظام آ سکتا ہے تو وہ ضرور اس کے لیے کام کریں' تاہم ایسے لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ باہم متحد ہو جائیں' تاکہ اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لینے والے تو ایک پلیٹ فارم پر آ جائیں۔ اگر آپ نے اسلام کو ایک پارٹی ایشو بنا ہی لیا ہے تو معاشرے میں اسی بنیاد پر polarization ہو جانی چاہیے۔ سیکولر ذہن کے لوگ ایک طرف ہوں اور مذہبی ذہن کے لوگ ایک طرف' اور اگر مذہبی کیمپ پانچ حصوں میں بٹا ہوا ہوگا تو پھر وہی کچھ ہوگا جو اب تک ہو رہا ہے کہ دن بدن عزت کا دھیلا ہو رہا ہے۔ علماء کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ان کے کچھ بیانات ضرور اخبارات میں چھپ جاتے ہیں' لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشرے پر علماء کی گرفت بتدریج ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور یہ سارا نتیجہ اس غلط



حکمت عملی کا ہے جو ان کی طرف سے اختیار کی گئی ہے۔''
(مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی' صفحہ ۵۱ تا ۵۳)

پس ہماری رائے یہ ہے کہ الیکشن نفاذِ اسلام کے لیے سودمند نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے اور اس ذریعے سے اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا۔ البتہ اگر کوئی یہ راستہ اختیار کرتا ہے تو ہم اسے حرام نہیں سمجھتے لیکن اختلاف کا اظہار کریں گے اور اسے اس راستے کی طرف لانے کی کوشش بھی کریں گے جسے ہم دیانتاً صحیح راستہ سمجھتے ہیں۔ ہم فاضل مضمون نگار کو یاد دلانا اور ان کی وساطت سے قارئین ''البرہان'' کو یہ بھی بتانا چاہیں گے کہ بانی تنظیمؒ نے سطور بالا میں جس وسعتِ قلبی کا اظہار کیا اس کا عملی ثبوت یوں فراہم کیا کہ دینی سیاسی جماعتوں نے ۲۰۰۴ء میں ایم ایم اے (متحدہ مجلس عمل) کی صورت میں جب متحد ہو کر الیکشن لڑنے کا اعلان کیا تو محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی حمایت میں ایک اخباری اشتہار کی صورت میں لوگوں سے اپیل کی کہ نفاذِ شریعت کی خاطر قوم کو چاہیے کہ ایم ایم اے کو ووٹ دے۔

اگرچہ مضمون نگار کی نگاہ میں ہمارا صبح وشام احتجاجی تحریک کی طرف بلانا مناسب نہیں' لیکن ہم اس کے باوجود اس کی طرف بلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہ یہی راستہ ہمارے خیال میں درست ہے۔ پھر اب تو انتخاب میں متحرک لوگوں کے ذہن میں بھی انتخابی راستے کے حوالے سے عدمِ اطمینان پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ہمارا اشارہ (سابق) امیر جماعت اسلامی جناب منور حسن صاحب مدظلہ کے ''اشارات'' کی طرف ہے جو جون ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے فوراً بعد ترجمان القرآن میں شائع ہوئے۔ انتخابی دھونس ودھاندلی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

> ''تو بجا طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس انتخابی عمل کی کتنی اصلاح ممکن ہے؟ اور سیاسی قیادت کو بروئے کار لانے کا یہ طریقہ کہاں تک تبدیلی یا انقلاب کے لیے نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے؟''
>
> ''یہ احساس بجا طور پر پایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی اس کامیابی سے دُور نظر آتی ہے جو ہمارے پیش نظر تھی اور جو نظم جماعت' امیدواران اور کارکنان کی آراء اور تجزیے کے نتیجے میں محسوس ہوتی تھی۔ بہت چھوٹے دائرے میں کامیابی ہوئی۔ کارکن اگرچہ اس لحاظ سے مطمئن ہوتا ہے کہ ہماری جدوجہد دین کے غلبے کی جدوجہد ہے اور ہمارے ذمے اپنے حصے کا کام کرنا ہے لیکن یہ بات پھر بھی درست ہے کہ ہم الیکشن کو تبدیلی کا ایک ذریعہ سمجھتے رہے اور سمجھتے ہیں' اس لیے یہ کارکردگی اور نتائج کئی سوالات کو جنم دیتے

ہیں، جن پر سنجیدہ غور وفکر اور ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور آبادی کے لحاظ سے منظرنامے کو سامنے رکھ کر مؤثر حکمت عملی اور نقشہ کار تیار کرنے کی ضرورت ہے۔''

''اس پس منظر میں کچھ اور بھی بنیادی سوالات ذہنوں میں کروٹیں لے رہے ہیں۔ خصوصیت سے ترکی، عرب دنیا، ملائیشیا اور دوسرے مسلم ممالک میں اسلامی قوتوں نے جو تجربات کیے ہیں، ان کو بھی غور سے دیکھنے اور ان کے تجربات کی روشنی میں سیکھنے کی ضرورت ہے، لیکن اپنے حالات کے مطابق نئی راہوں کی تلاش نہ صرف یہ کہ شجر ممنوعہ نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بنتی جارہی ہے۔ بلاشبہ یہ راہ مسائل اور مشکلات سے عاری نہیں اور اپنی پیچیدگیاں بھی رکھتی ہے اور امکانات بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انمل بے جوڑ پیوندکاری سے اجتناب کیا جائے اور اپنے حالات کے مطابق ایک سوچے سمجھے عمل کے ذریعے تسلسل کو مجروح کیے بغیر تبدیلی اور نئے تجربات کے امکانات کا جائزہ لیا جائے اور مفید اور قابلِ عمل اقدامات سے گریز نہ کیا جائے۔''

یہاں بانی جماعت اسلامی مولانا مودودیؒ کے الفاظ بھی یاد کر لینے چاہئیں کہ:

''اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔''

(تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، صفحہ ۱۰۶)

محترم محمد رشید صاحب، خدارا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اب جب کہ ساٹھ سالہ انتخابی جدوجہد سے جوہر اقتدار 'ہاتھ' نہیں آ سکا بلکہ حالیہ الیکشن کے نتائج بتا رہے ہیں کہ اس میدان میں دینی جماعتوں کا گراف مزید نیچے گر چکا ہے، تو کیا عقلِ عام، دانشمندی اور اخلاص کا یہ تقاضا نہیں ہوگا کہ آئندہ انتخابی سیاست کے اجتہادی راستے کو چھوڑ کر دیگر جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے؟ جبکہ وہ دیگر جائز شرعی ذریعہ جو تنظیم اسلامی کے پیش نظر ہے، اس کی تصویب وتائید سطور بالا میں علامہ محمد یوسف قرضاوی، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی جیسے جید علماء اور اکابر ملت کی تحریروں کے ذریعے ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ۲۰۱۰ء میں پاکستان بھر کے اکابر دیوبند کے سہ روزہ اجلاس کا حاصل جس 'متفقہ اعلامیہ' کی صورت میں سامنے آیا، اس میں بھی اس کی بھرپور تصویب وتائید موجود ہے۔ پرامن احتجاجی تحریک بھی چونکہ حرام نہیں بلکہ ایک جائز ذریعہ ہے لہٰذا انتخابات سے کنارہ کش ہوتے ہوئے 'انقلابی یا تحریکی طرز' پر کام شروع کیا جائے۔ پھر اسی خاص نقطہ نظر سے کارکنان کی تربیت کی جائے اور



جب جماعت مضبوط ہو جائے تو پھر ایک بھرپور احتجاجی تحریک کے ذریعے باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی جائے۔

فاضل مضمون نگار نے اپنی تحریر میں تنظیم اسلامی کے اساسی نظریات پر مشتمل بعض کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ تنظیم اسلامی کا رویہ ان فکری بنیادوں کے برعکس ہے۔ موصوف کی تنقید اور اپنے کردار کا جائزہ لینے کے بعد ہم دیانتاً یہ سمجھتے ہیں کہ بحمد اللہ تنظیم اسلامی نظری اور فکری طور پر انہی نظریات پر گامزن ہے جو ان کتابوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ عملی طور پر ہمیں کتنی کامیابی مل سکی، یہ ایک الگ بحث ہے۔ تربیتی پروگراموں میں تنظیم کی ''قراردادِ تاسیس'' کا بار بار مطالعہ اور اس کے تناظر میں تنظیم کے موجودہ رویہ کا خود احتسابی کے انداز میں جائزہ اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے معمولات کا مستقل جزو ہے۔ تاہم ہم اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ توسیع دعوت اور تربیت وتزکیہ کے بعض پہلوؤں سے ہم ابھی معیارِ مطلوب سے پیچھے ہیں۔

## حرفِ آخر

محمد رشید صاحب کی طرف سے پیش کیے گئے اعتراضات کے جوابات میں ہم نے جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے لٹریچر سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ یہ اقتباسات ثابت کرتے ہیں کہ پیش کیے گئے اعتراضات درست نہیں ہیں۔ اِن اعتراضات کا سبب بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ معترض نے دقتِ نظر سے جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا۔ مناسب یہی ہوتا ہے کہ کسی شخصیت، جماعت یا تحریک کی فکر اور طریق کار پر اعتراض سے قبل اُس کے لٹریچر سے متعلقہ مواد کے ہر پہلو کا مطالعہ کر لیا جائے۔ موصوف کے پیش کردہ اہم اعتراضات کا جواب بحمد اللہ ہم نے دے دیا ہے۔ البتہ ہماری رائے میں موصوف نے چند اور ضمنی اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اگر موصوف ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تصانیف ''برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تعمیل وتجدید اور اس سے انحراف کی راہیں'' اور ''تحریکِ جماعتِ اسلامی...... ایک تحقیقی مطالعہ'' کا بغور مطالعہ فرما لیں تو اُنہیں اپنے اِن اعتراضات کا جواب مل بھی جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں خلوص کے ساتھ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مثبت انداز سے اپنی توانائیاں لگانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

# شُحُّ النّفس

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان کے لیے خواہش نفس کو کنٹرول کرنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اس اعتبار سے ہر آدمی امتحان میں ہے۔ اور جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے وہی انجام کار فلاح یافتہ ہے۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ دو مرتبہ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑨﴾ (الحشر:۹ و التغابن:۱۶) ''اور جو شخص حرصِ نفس سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں''۔ خواہش نفس پر کنٹرول اس لیے مشکل ہے کہ انسان خود پسند واقع ہوا ہے' جہاں اسے اپنا نقد نفع ملتا ہے وہاں وہ اس چیز کو بھلا دیتا ہے کہ یہ کام انجام کے اعتبار سے مفید ہے یا مضر۔

انسان کا دل چاہتا ہے کہ لوگ اس کی خوبیوں کی تعریف کریں۔ گویا وہ اپنے اچھے کاموں کا نقد فائدہ چاہتا ہے' حالانکہ اگر نیکیوں کا دنیا ہی میں صلہ مل گیا تو آخرت کے اعتبار سے ایسی نیکیاں سودمند نہ ہوں گی۔ جب بندہ کسی نیکی کے کام میں خرچ کرتا ہے تو نفس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں' حالانکہ جس صدقہ وخیرات کا اسے دنیا کی زندگی میں تعریف کی صورت میں بدلہ مل گیا اسے آخرت میں اس کا ثواب نہ ملے گا۔ ہاں اگر کوئی شخص صدقہ کرتا ہے اور لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں مگر خرچ کرنے والا نہ تو لوگوں سے تعریف کی امید رکھتا ہے اور نہ اس پر پھولتا ہے بلکہ وہ خواہش کرتا ہے کہ اس کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی صدقات وخیرات میں آگے بڑھیں تو اس صورت حال میں گویا وہ خواہش نفس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم حدیث میں اس صدقے کو بہترین کہا گیا ہے جو اس طرح کسی مستحق کو دیا جائے کہ دینے والے کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ گویا ایسا شخص چاہتا ہے کہ میرے اس عمل کا ثواب مجھے آخرت میں چاہیے نہ کہ دنیا میں۔ قرآن مجید



میں ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ﴾ (البقرة:۲۷۱) ''اور اگر تم علانیہ خیرات دو تو یہ بھی اچھی بات ہے' اور اگر اس کو چھپاؤ اور چپکے سے فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے''۔ اس میں یہی بات واضح کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے نفس پر کنٹرول کر سکو اور نیت یہ ہو کہ دوسرے لوگ بھی آپ کو دیکھ کر صدقہ کریں تو یہ بھی اچھا ہے' لیکن اگر دینے والے کو اندیشہ ہو کہ اس طرح لوگ اس کی تعریف کریں گے' لہٰذا کہیں اس میں ریاکاری شامل نہ ہو جائے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ اپنا صدقہ انتہائی چھپا کر دے کہ دوسروں کو کانوں کان خبر نہ ہو اور اس کام پر اس کی تعریف نہ کی جائے' تاکہ اس کی یہ نیکی اس کے لیے توشۂ آخرت بن جائے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اگر کسی نادار کی مالی مدد خواہ چھپا کر ہی کی' مگر اس نیکی پر اس نادار پر رعب جمایا' طعنہ دیا' احسان جتایا یا بلا معاوضہ اس سے خدمت لی تو گویا ایسے کرنے والے نے اپنی اس نیکی کا صلہ دنیا ہی میں لے لیا اور آخرت میں وہ اس نیکی کے ثواب سے محروم رہے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ (البقرة:۲۶۴) ''مومنو! اپنے صدقات (وخیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یومِ آخر پر''۔ آگے ایسے آدمی کی خیرات کی مثال اس طرح دی گئی ہے جیسے صاف پتھر پر کچھ مٹی پڑی ہو۔ پھر مینہ برسے تو وہ ساری مٹی بہہ جائے اور کچھ ہاتھ نہ لگے' یعنی بارش کا کچھ مثبت اثر نہ ہو۔ اسی طرح اگر خیرات اس طرح کی کہ فقیر سے بیگار لی یا احسان جتایا یا اسے کسی اور طرح ایذا دی تو یہ خیرات ضائع گئی۔

صحابہ کرام ؓ کی خیرات اور فی سبیل اللہ خرچ کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے اعلانیہ خرچ کیا۔ اس سلسلہ میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام ؓ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اُن کا یہ خرچ ریاکاری کا مظہر نہ تھا' بلکہ وہ بعد کے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید مثالیں تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے مقام و مرتبے سے کون واقف نہیں' انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے اونچا مقام انہی کا تھا۔ انہوں نے جنگ تبوک کی تیاری کے موقع پر اپنے گھر کا تمام اثاثہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے اپنے مال کا نصف فی

سبیل اللہ دے دیا۔ اسی طرح حضرت ابوطلحہ ؓ نے اپنا قیمتی باغ خیرات کر دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے یہ خرچ اس قدر ظاہر تھے کہ آج ہم ان سے واقف ہیں‘ مگر یہاں ریاکاری کا عنصر عنقا تھا‘ بلکہ اس سے اُمت کے سامنے وضاحت ہوتی ہے کہ اصحابِ رسول انفاق فی سبیل اللہ کے معاملے میں کس قدر فراخ دل تھے۔

اسلام اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کے ساتھ اس خواہش کے تحت بھلائی کی جائے کہ اس کی طرف سے جواب میں زیادہ ملے گا۔ سورۃ المدثر میں فرمایا: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶﴾ ’’احسان اس طرح نہ کرو کہ بدلے میں بہت ملے‘‘۔ گویا اسلامی تعلیم یہ ہے کہ کسی پر احسان صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اور کسی دُنیوی مفاد کی امید نہ رکھی جائے۔ یہی مطلب ہے اس محاورہ کا کہ ’’نیکی کر دریا میں ڈال‘‘۔ یعنی نیکی صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے کی جائے اور اس پر کسی اجر کی توقع نہ رکھی جائے۔

بڑے سے بڑا نیک عمل اگر خواہش نفس کے تحت کیا جائے‘ یعنی لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے تو وہ ثواب کی بجائے گناہ کا باعث بن جاتا ہے۔ نماز اہم ترین عبادت ہے لیکن نماز پڑھنے والے کے پیش نظر اگر اللہ کی بجائے لوگوں کی خوشنودی ہو تو یہی عمل بدترین گناہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶﴾ (الماعون) ’’خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے‘ جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں (جو دکھلاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں) جو ریاکاری کرتے ہیں‘‘۔ یعنی وہ نمازوں کی ادائیگی اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو راضی کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ نمازی ہونے کی بنا پر لوگ ان پر اعتبار کریں‘ ان کو متقی اور اچھا مسلمان سمجھیں اور وہ لوگوں کے اس اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔

نیکی کے کام میں رضائے الٰہی کے علاوہ کسی بھی درجے میں کچھ مطلوب ہو تو وہ کام قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ اپنے ایک نادار قریبی رشتہ دار مہاجر صحابی حضرت مسطح ؓ کی امداد اور خبر گیری کرتے تھے۔ جب اُم المومنین حضرت عائشہ ؓ پر بے بنیاد تہمت لگائی گئی اور اس سلسلے میں طوفانِ بدتمیزی اٹھایا گیا تو بعض مسلمان نادانی میں منافقین کے ساتھ شریک ہو گئے۔ ان میں حضرت مسطحؓ بھی تھے۔ جب قرآن مجید میں حضرت عائشہ ؓ کی براءت پر مشتمل آیات نازل ہو گئیں تو حضرت ابوبکر ؓ کو حضرت مسطحؓ پر بہت



رنج ہوا اور آپؓ نے قسم کھائی کہ آئندہ مسطح کی مدد نہ کروں گا۔ اس پر سورۃ النور کی آیات نازل ہوئیں جن میں حضرت ابوبکرؓ کے اس عمل کو ناپسند کیا گیا۔ یہ آیات آنے پر حضرت ابوبکر ؓ نے مسطح کی امداد بحال کر دی بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ نے اس کی امداد دگنی کر دی۔ گویا حضرت ابوبکر ؓ مسطحؓ کے ساتھ ناراضگی میں یہ بات بھول گئے کہ وہ اس کے ساتھ بھلائی صرف اس کی ناداری کی وجہ سے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لیے آیات نازل کر دیں‘ جس سے ابوبکر صدیقؓ سمجھ گئے کہ مسطحؓ کی غربت تو ویسی ہی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مطلوب ہے۔ چنانچہ انہیں حضرت مسطحؓ سے جو ناراضگی پیدا ہو گئی تھی انہوں نے رب کی رضا کی خاطر اسے ختم کر دیا۔

اگر کوئی شخص نیکی کا کام کرے اور وہ پسند کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں تو سمجھ لیجیے کہ وہ نفس کی خواہش کا شکار ہو گیا ہے‘ لیکن اگر وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ لوگوں میں اُس کی اس نیکی کا چرچا ہو اور نہ ہی وہ اپنی اس نیکی کی تشہیر سے خوش ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نیکی اللہ کی رضا کے لیے کی تھی‘ نہ کہ اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے۔ بعض لوگ اس معاملے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں اور وہ جب لوگوں میں اپنی تعریف کے چرچے سنتے ہیں تو خوش ہونے کی بجائے ناخوش ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ ان کی نیکیوں کو مشتہر کریں۔ چنانچہ وہ جان بوجھ کر لوگوں کے سامنے کوئی قابلِ اعتراض عمل کر دیتے ہیں تاکہ لوگ ان کا قابلِ اعتراض عمل دیکھ کر ان سے دور ہو جائیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کی نیکیاں بس اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کے لیے ہیں۔ وہ اپنے نیک اعمال کا بدلہ عوام الناس کی طرف سے تعریف کی صورت میں ہرگز نہیں لینا چاہتے۔

اگر ایک واعظ کی یہ خواہش ہو کہ اس کا وعظ سن کر لوگ اس کی تعریف کریں تو سمجھ لیجیے کہ وہ نفس کے لالچ کا شکار ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ چاہتا کہ اس کا وعظ کسی طرح کے معاوضے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا معاوضہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ اسی طرح ایک شخص شوقیہ بلامعاوضہ مسجد کی خدمت کرتا ہے‘ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کے کام کی تعریف کرتے ہیں۔ اب اگر وہ اپنی اس حیثیت کا کسی طور پر بدلہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے تو وہ سمجھ لے کہ اس کا اجر آخرت کے اعتبار سے کالعدم ہو گیا۔ مسجد کی خدمت پر مامور ملازم کا معاملہ دوسرا ہے کہ وہ اس کا روزگار ہے۔ اسی طرح دین کی خدمت کا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔

مختصر یہ کہ اپنے نفس پر کڑا پہرہ رکھنا چاہیے‘ ورنہ اچھے عمل نتیجے کے طور پر بے اثر ہوتے جائیں گے۔ حج جیسا عمل بھی نتیجہ خیز نہ رہے گا۔ اگر خواہش نفس کا تقاضا یہ ہو کہ لوگ حاجی کہیں گے اور یہ حاجی اپنے حج کو نیکی اور دیانت داری کے اشتہار کے طور پر استعمال کرے گا تو ایسا حج نتیجہ خیز نہ ہوگا۔ حج تو وہ ہے جو حاجی کے کردار میں مثبت تبدیلی پیدا کرے‘ ورنہ یہ نمائشی حج صرف دُنیوی زندگی میں اپنا نتیجہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں حجِ مَبرور تو وہ ہوگا جو صرف رضائے الٰہی کے لیے ادا کیا گیا ہو اور اس سے کسی طرح کا دنیا کا نقد منافع مطلوب نہ ہو۔ ورنہ حج بھی باقی نمائشی اعمال کی طرح ہوائے نفس کی نذر ہو جائے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ’’بے شک نفس تو برائی پر شدید اُبھارتا ہے‘‘۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا: ﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۹﴾ ’’اور وہ جو نفس کے لالچ سے بچا لیے گئے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں‘‘۔ نفس کو راہِ راست پر لانا بہت مشکل کام ہے‘ مگر حقیقی کامیابی کے لیے خواہشِ نفس پر کنٹرول ناگزیر ہے۔ اسلام ہمیں جو جامع‘ قابل عمل اور آسان ہدایت دیتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ سلام کو پھیلاؤ‘ اس لیے کہ اس سے محبت بڑھتی ہے اور انانیت دبتی ہے۔ ہمیں درس دیا گیا ہے کہ ہم اس انتظار میں نہ رہیں کہ سامنے سے ملنے والا ہمیں سلام کرے بلکہ خود آگے بڑھ کر سلام میں پہل کریں۔ یہ نفس کی سرکشی کا آسان مگر مؤثر علاج ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْبَادِئُ بِالسَّلَامِ بَرِیْءٌ مِنَ الْكِبْرِ)) (رواہ البیہقی) ’’سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہوتا ہے‘‘۔ کیونکہ وہ ملنے والے کو عزت دیتا ہے اور اپنی انانیت کو مٹاتا ہے۔ ہوائے نفس برتری کا زعم پیدا کرتی ہے جبکہ سلام میں پہل کرنے سے انسان خود سر نفس کو دباتا ہے۔

نفس کی سرکشی کا بڑا سبب تکبّر ہے جو بڑی اخلاقی برائی ہے۔ اس برائی کو دور کرنے کے لیے انسان کو ہمہ وقت مستعد رہنا چاہیے۔ تکبّر کی سنگینی کو واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ)) (صحیح مسلم) ’’جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا‘‘۔

اسلام نمائش اور بڑائی کے اظہار کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے برعکس عاجزی اور انکساری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بڑے لوگ پسند کرتے ہیں کہ جب وہ کسی جگہ جائیں تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ پسند نہیں کرتے تھے کہ

(باقی صفحہ 98 پر)

# اُمُّ المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا

## حالات، فضائل اور خدماتِ اسلام

حافظ محمد زاہد☆

بنی نوعِ انسان کے طبقہ نسواں میں سب سے زیادہ فضیلت کی حامل وہ پاکیزہ ہستیاں ہیں جنہیں ازواجِ مطہرات اور اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان ازواج مطہرات میں سے بھی اوّلیت اور افضلیت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے جو نبی مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی زوجہ اور اس اُمت کی پہلی ''ماں'' تھیں۔ ان کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کی باری آتی ہے جو اس اُمت کی دوسری ماں ہیں۔

اس مضمون میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے مختصر سوانح حیات، خصوصی فضائل اور خدماتِ اسلام کو بیان کیا جائے گا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی تمام عورتیں اُمہات المؤمنین کو اپنا آئیڈیل بنا کر ان کے طرزِ زندگی کو اپنائیں تاکہ ان کو گھریلو زندگی میں سکون اور آخرت میں آرام میسر آئے۔

### حسب ونسب اور ماضی کی ایک جھلک

آپؓ کا نام سودہ اور باپ کا نام زمعہ بن قیس تھا، جو قریش کے قبیلے عامر بن لؤی سے تعلق رکھتا تھا۔ آپؓ کی ماں کا نام سموس بنت قیس تھا جو انصار کے خاندان بنونجار سے تعلق رکھتی تھی۔ آپؓ کا پہلا نکاح آپ کے چچازاد بھائی سکران بن عمرو سے ہوا۔

### بُت پرستی سے نفرت اور ''السابقون الاوّلون'' کا اعزاز

اللہ تعالیٰ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو نہایت صالح طبیعت عطا کی تھی۔ دورِ جاہلیت میں بھی چند افراد ایسے تھے جن کو بت پرستی سے نفرت تھی، ان میں حضرت سودہؓ بھی شامل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور دین حق کی تبلیغ شروع کی تو آپؓ نے فوراً اس دعوت کو قبول کیا۔ اس طرح آپؓ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں قرآن نے ''السابقون الاولون'' قرار دیا ہے۔

☆ ادارتی معاون، شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی، لاہور۔ 03214291904



تاریخ کی کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سودہؓ کے اسلام قبول کرنے سے قریشِ مکہ کو سخت تکلیف ہوئی۔ اس لیے کہ اِس سے پہلے نوعمر (۱۲ سال سے ۲۵ سال تک کے) لوگ مشرف باسلام ہو رہے تھے، جس پر کفار نے یہ پروپیگنڈا اختیار کیا کہ نوعمر لوگوں کا کسی نئی انقلابی تحریک میں شامل ہونا فطری بات ہے۔ لیکن جب حضرت سودہؓ نے اسلام قبول کیا تو اس وقت اُن کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اس طرح کُفّار کا یہ پروپیگنڈا ختم ہو گیا اور قریش مکہ بہت سیخ پا ہوئے۔

### تبلیغِ اسلام اور ہجرتِ حبشہ

حضرت سودہؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد دینِ اسلام کی تبلیغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور آپؓ کی تبلیغ سے آپؓ کے سلیم الفطرت شوہر نے بھی اسلام قبول کیا اور ان کے خاندان کے بھی کئی افراد مشرف باسلام ہوئے، جن میں حضرت سکران کے بھائی اور اُن کی بیویاں قابل ذکر ہیں۔ قریش مکہ کو جب حضرت سودہؓ اور اُن کے شوہر کے قبولِ اسلام اور تبلیغ اسلام کا پتا چلا تو انہوں نے اس سلیم الفطرت جوڑے پر ظلم وستم کی بارش شروع کر دی اور ان کو طرح طرح سے اذیتیں دی جانے لگیں۔ جب یہ ظلم وستم بڑھتا چلا گیا تو حضرت سودہ اور حضرت سکران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور کئی برس وہاں رہنے کے بعد واپس مکہ آ گئے اور دوبارہ سے تبلیغ اسلام کے کام میں آپؐ کے شانہ بشانہ شامل ہو گئے۔

### خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ بننے کی بشارت

طبقاتِ ابن سعد میں مذکور ہے کہ حبشہ سے واپسی پر حضرت سودہؓ کو خواب کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کی بشارت دی گئی۔ ایک رات خواب میں آپؓ نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپؓ کے گھر تشریف لائے اور آپؓ کو گردن سے پکڑا۔ اس کی تعبیر حضرت سکرانؓ نے یہ بیان کی کہ میرے فوت ہو جانے کے بعد تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ ؤ گی۔ اس کے بعد ایک رات آپؓ نے خواب میں دیکھا کہ آپؓ تکیہ کے سہارے لیٹی ہیں کہ آسمان پھٹا اور چاند ان پر گر پڑا۔ اس خواب کی تعبیر بھی ان کے شوہر نے یہ بیان کی کہ میں بہت جلد فوت ہو جاؤں گا اور تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ بنو گی۔

چند دن بعد ان خوابوں نے حقیقت کا روپ دھارا اور حضرت سکرانؓ اچانک بیمار ہوئے اور کچھ ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح حضرت سودہؓ بیوہ ہو گئیں۔

## نبی کریم ﷺ کی طرف سے پیغامِ نکاح

حضرت سکرانؓ کی وفات دس نبوی کو ہوئی اور اسی سال حضرت خدیجہ ؓ اور آپؐ کے چچا ابوطالب بھی وفات پا گئے۔ آپ ﷺ نے اس سال کو ''عام الحزن''، یعنی غم کا سال قرار دیا۔ ایک طرف نبی اکرم ﷺ اس حوالے سے پریشان تھے تو دوسری طرف آپؐ کی طبیعت بن ماں کی بچیوں کو دیکھ کر افسردہ رہتی تھی۔ اس کے علاوہ مشرکین نے بھی اس موقع پر آپؐ پر ظلم وزیادتی کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔ اس صورتِ حال میں رسول کریم ﷺ کی ایک جاں نثار صحابیہ حضرت خولہ بنت حکیم (زوجہ عثمان بن مظعون) ؓ نے ایک دن بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر آپؐ کی دوسری شادی کی بات کی۔ یہ گفتگو ایک مکالمے کی شکل میں ہوئی:

خولہ: یارسول اللہ! خدیجہؓ کی وفات کے بعد میں آپؐ کو ہمیشہ غمزدہ دیکھتی ہوں۔

محمد ﷺ: ہاں، گھر کا انتظام اور بچوں کی تربیت خدیجہ ہی کے سپرد تھی۔

خولہ: آپؐ کو ایک رفیق وغمگسار کی ضرورت ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں آپؐ کے نکاحِ ثانی کے لیے کوشش کروں۔

محمد ﷺ: تمہاری نگاہ میں ایسی کون سی خاتون ہے جن کو تم ان حالات میں مناسب سمجھتی ہو؟

خولہ: سودہ بنت زمعہ۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت خولہؓ کی یہ باتیں سن کر فرمایا کہ تم ہی ان کو میرا پیغام پہنچاؤ۔ حضرت خولہؓ سیدھے حضرت سودہؓ کے پاس گئیں اور ان سے رسول کریم ﷺ کی خواہش بیان کی، جس پر حضرت سودہؓ نے بخوشی اپنی رضامندی ظاہر کر دی، لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلہ میں میرے والد سے بات کرو۔ حضرت خولہؓ آپ کے والد زمعہ کے پاس گئیں تو انہوں نے بھی بخوشی اس رشتہ کو قبول کر لیا۔

## نکاح کی تقریب

نبی کریم ﷺ حضرت سودہ ؓ کے گھر گئے۔ وہاں حضرت سودہؓ کے والد زمعہ نے اپنی بیٹی کا نکاح نبی کریم ﷺ سے چار سو درہم بحق مہر کے خود پڑھایا (تاریخ ابن کثیر میں ہے کہ ان کا نکاح حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے، جبکہ طبقاتِ ابن سعد میں ہے کہ حاطب بن عمرو نے پڑھایا)۔ حضرت سودہ کے بھائی عبداللہ بن زمعہ، جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، مکہ سے باہر تھے، جب وہ واپس آئے تو اس نکاح کا سن کر سخت رنجیدہ ہوئے اور اپنے سر پر خاک ڈالی۔



کچھ مدت بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور شرفِ صحابیت سے سرفراز ہوئے، لیکن انہیں ساری عمر اپنی اس نادانی کا بہت افسوس رہا۔

نبی کریم ﷺ اور حضرت سودہ ؓ کا نکاح شوال دس نبوی میں ہوا۔ اُس وقت آپؐ کی عمر پچاس سال تھی۔

## نبی اکرم ﷺ کی زوجہ ثانیہ: حضرت سودہؓ یا حضرت عائشہؓ؟

تاریخ ابن کثیر میں مذکور ہے کہ جب حضرت خولہؓ نے آپ ﷺ سے دوسری شادی کی بات کی تو آپؐ نے فرمایا: کس سے؟ خولہ نے پوچھا: دوشیزہ کا بتاؤں یا ثیبہ یعنی شوہر دیدہ کا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دوشیزہ کون اور شوہر دیدہ کون؟ خولہ نے کہا: دوشیزہ عائشہ بنت ابی بکر اور شوہر دیدہ سودہ بنت زمعہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم خود ہی جاؤ اور ان سے میرے نکاح کی بات کرو۔ تو حضرت خولہؓ حضرت سودہؓ کے پاس بھی گئیں اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پاس بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نبی کریم ﷺ سے نکاح کے لیے۔ تو دونوں نے نبی اکرم ﷺ کے رشتہ کو قبول فرمایا اور دونوں ہی آپ کی زوجیت میں آ گئیں۔ اس حوالے سے روایات میں اختلاف ہے کہ پہلے حضرت سودہ کا نکاح ہوا یا حضرت عائشہ کا۔ امام ابن سعد (طبقات ابن سعد)، علامہ ابن اثیر (اُسد الغابہ)، علامہ ابن حجر عسقلانی (الاصابہ) اور اکثر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ حضرت خدیجہ ؓ کی وفات کے بعد حضرت سودہ ؓ نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں اور ان کے بعد حضرت عائشہ ؓ۔ جبکہ امام ابن کثیر اور بعض مؤرخین کی رائے اس کے برعکس ہے۔ البتہ اس میں تو سب کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت سودہ ؓ کا ازدواجی تعلق مکہ میں دس نبوی میں قائم ہوا، جبکہ حضرت عائشہ ؓ کی رخصتی ہجرت کے بعد ہوئی اور ازدواجی تعلق مدینہ میں قائم ہوا۔ ازدواجی تعلق کی اس ترتیب کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت سودہؓ کو زوجہ ثانیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

## خدمت گزار بیوی اور آئیڈیل ماں

حضرت سودہ ؓ کا نکاح جب نبی کریم ﷺ سے ہوا تو اُس وقت آپؐ کی بیٹیاں کم عمر تھیں۔ حضرت سودہؓ نے ان کی پرورش بہت اعلیٰ انداز میں کی اور انہیں حقیقی ماں کی طرح پیار بھی دیا اور شفقت بھی۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کی طبیعت جو بن ماں کی بچیوں کو دیکھ کر افسردہ رہتی تھی وہ افسردگی ختم ہو گئی۔ پھر حضرت سودہؓ نے ان بچیوں کی شادیوں کا اہتمام بھی بڑے

احسن طریقے سے کیا۔

اس کے ساتھ آپؓ نے نبی کریم ﷺ کا بھی ہر طرح سے نہ صرف خیال رکھا بلکہ ان مشکل حالات میں جب مکہ میں ہر طرف نبی کریم ﷺ کی مخالفت ہو رہی تھی' آپ ﷺ کا ہمیشہ حوصلہ بڑھایا اور آپؐ کی خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ گھر کی طرف سے بے فکر ہو کر ہمہ وقت اسلام کی تبلیغ میں لگ گئے۔ حضرت سودہؓ نے دعوت و تبلیغ دین میں بھی آپ ﷺ کا ساتھ دیا۔

## ہجرتِ مدینہ اور کاشانہ نبوت کی تعمیر

نبوت کے تیرہویں سال اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ مدینہ ہجرت کر گئے اور اپنی بیٹیوں کو حضرت سودہؓ کے حوالے کر گئے۔ آپؓ نے اس موقع پر بھی بڑی بہادری اور خوش اسلوبی سے یہ ذمہ داری پوری کی اور تقریباً سات ماہ آپؓ نے اکیلے ہی مکہ میں گزارے۔ جب مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہوئی تو آپؐ نے مسجد کے ساتھ ہی حضرت سودہ اور حضرت عائشہ کے حجرے بنوائے۔ پھر آپؐ نے حضرت سودہ اور اپنی بیٹیوں کو مدینہ بلا لیا۔

حضرت سودہ کا حجرہ صرف ایک مکان نہیں تھا بلکہ کاشانہ نبوت کا درجہ رکھتا تھا' جہاں نبی آخر الزماں ﷺ کی رہائش تھی اور یہیں سے تمام احکامات جاری ہوتے تھے۔

## معاشی تنگدستی میں بھی شکر کے جذبات

نبی اکرم ﷺ نبوت سے پہلے تو تجارت کیا کرتے تھے' لیکن جب آپؐ کو نبوت ملی تو اس کے بعد آپؐ کی کسی تجارت کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ آپؐ ہمہ وقت دین کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہتے تھے اس لیے معاش کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس طرح گھر کی معاشی حالت کبھی فاقوں تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ اس حوالے سے حضرت ابوہریرہ ؓ کا ایک قول ملاحظہ ہو:

''رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن بھی آسودہ ہو کر کھانا نہیں کھایا' یہاں تک آپؐ کی وفات ہو گئی۔'' (صحیح البخاری)

اس معاشی حالت کے باوجود ہماری ماں حضرت سودہ ؓ کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نہیں آتی اور نہ کبھی آپؓ نے نبی اکرم ﷺ سے اس حوالے سے کوئی شکایت کی' بلکہ آپؓ تو ان حالات میں نبی اکرم ﷺ کو دلاسہ بھی دیا کرتی تھیں۔ حضرت سودہ کا یہ رویہ آپؐ اور کاشانہ نبوت کے لیے سکون کا ذریعہ ثابت ہوا۔



اگر آج کی عورتیں بھی حضرت سودہؓ کا یہ رویہ اپنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے گھروں میں بھی سکون اور راحت میسر آئے اور اُن کے شوہروں کے دلوں میں اُن کے لیے محبت اور تعظیم کے جذبات پیدا ہوں۔

## نبی آخر الزماں ﷺ کی مسکراہٹ کا ذریعہ

حضرت سودہؓ کے مزاج میں تیزی کے ساتھ ظرافت بھی تھی جس سے رسول کریم ﷺ خوش ہوتے تھے۔ حضرت سودہؓ کبھی کبھی جان بوجھ کر بے ڈھنگے پن سے چلتی تھیں کہ حضورؐ دیکھتے تو بے ساختہ مسکرا دیتے۔ ایک رات نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے تو حضرت سودہؓ بھی آ کر ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ نبی کریم ﷺ نے طویل رکوع کیا۔ صبح حضرت سودہؓ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ گزشتہ شب میں نے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپؐ نے اتنا لمبا رکوع کیا کہ میں نے اپنی نکسیر پھوٹنے کے اندیشہ سے اپنی ناک پکڑ لی۔ نبی کریم ﷺ آپؓ کے اس اندازِ بیان پر مسکرا دیے۔ اس طرح حضرت سودہؓ اپنی باتوں اور حرکات سے نبی کریم ﷺ کی مسکراہٹ کا ذریعہ بنتی تھیں۔

## سخاوت وفیاضی جیسی صفات کی مالکہ

حضرت سودہ ؓ نہایت اعلیٰ اخلاق کی مالکہ' رحم دل اور سخی تھیں۔ جو کچھ ان کے ہاتھ آتا تھا وہ سب حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ حضرت سودہؓ دستکار تھیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی تھی اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتی تھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے ایک دفعہ ان کی خدمت میں درہموں کی ایک تھیلی ہدیۃً بھیجی۔ انہوں نے پوچھا: اس تھیلی میں کیا ہے؟ بتایا گیا: ''درہم'' تو جواب دیا: ''تھیلی میں کھجوروں کی طرح؟'' اور یہ کہہ کر تمام درہم ضرورت مندوں میں اس طرح بانٹ دیے جس طرح کھجوریں تقسیم کی جاتی ہیں۔

## چار سال تک تنہا حضور ﷺ کی خدمت گزاری کا اعزاز

حضرت خدیجہ ؓ کی وفات کے بعد آپؓ دس نبوی کو نبی کریم ﷺ کی زوجہ بنیں اور دو ہجری یعنی چار سال بعد حضرت عائشہ ؓ کی رخصتی ہوئی۔ اس طرح آپؓ چار سال تک تنہا نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہیں اور آپؐ کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ آنے دی۔ یہ ایسا اعزاز ہے جو حضرت خدیجہؓ کے بعد انہیں حاصل ہوا۔ ان دو ازواج کے علاوہ کسی کو اس طرح کا کوئی اعزاز حاصل نہیں ہے۔

## باقی ازواجِ مطہرات (سوتنوں) کے ساتھ مشفقانہ سلوک

نبی اکرم ﷺ اور باقی ازواج کی شادیاں حضرت سودہ ؓ کی موجودگی میں ہوئیں۔ آپؓ نے باقی ازواج (جنہیں عام الفاظ میں سوتن کہا جاتا ہے) سے ایسا مشفقانہ رویہ رکھا جس کی مثال آج کے دور میں ملنا تقریباً ناممکن ہے۔

حضرت سودہؓ کے پاکیزہ اخلاق، رفعت کردار اور اُن کے باقی ازواج کے ساتھ مشفقانہ رویوں کا اندازہ اس بات سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا:

''مجھے سودہ بنت زمعہ سے زیادہ عزیز کوئی عورت نہ تھی اور میری یہ تمنا تھی کہ کاش میں ان کے جسم میں ہوتی۔'' (صحیح مسلم)

جس عورت پر اس کی سوتن (اور وہ بھی حضرت عائشہ صدیقہ ؓ جیسی) کو رشک آئے تو آپ اور میں اس پاکیزہ خاتون کی فضیلت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

## رضائے نبوی ﷺ کے لیے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی

حضرت سودہ ؓ ایک طرف تو نبی کریم ﷺ کو اپنی باتوں اور مختلف قسم کی حرکات سے خوش کرتی تھیں تو دوسری طرف آپؓ نے اپنی باری بھی حضرت عائشہ ؓ کو دے دی تھی جس کا واحد مقصد نبی کریم ﷺ کی رضا اور خوشی کا حصول تھا۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے اور جس کا نام قرعہ میں نکلتا، اُسے سفر میں ساتھ لے کر جاتے۔ اور آپؐ نے اپنی ازواج کے درمیان ایک دن رات کی باری مقرر کی تھی ماسوائے اس کے کہ سودہ بنت زمعہ نے اپنی باری مجھے دے دی تھی اور اس کا مقصد نبی کریم ﷺ کی رضا مندی تھی۔'' (صحیح البخاری)

## حضرت سودہؓ اور حجاب کا حکم

حجاب کے حکم کے نزول سے قبل حضرت سودہ ؓ قضائے حاجت وغیرہ کے لیے باہر تشریف لے جاتی تھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ کا خیال تھا کہ ازواجِ مطہرات کو باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ اس حوالے سے انہوں نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سے عرض بھی کیا لیکن آپؐ خاموش رہے۔ ایک دن حضرت سودہؓ قضائے حاجت کے لیے جنگل کی طرف جا رہی تھیں کہ راستے میں حضرت عمرؓ مل گئے۔ حضرت سودہؓ چونکہ دراز قد تھیں اس لیے حضرت عمرؓ نے انہیں پہچان لیا اور



کہا: ''سودہ میں نے تم کو پہچان لیا ہے''۔ حضرت سودہؓ کو حضرت عمرؓ کا یہ جملہ سخت ناگوار گزرا اور انہوں نے رسول کریم ﷺ سے حضرت عمرؓ کی شکایت کی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی اور تمام خواتین کے لیے پردہ کو لازم کر دیا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۵۹﴾﴾ (الاحزاب)

''اے نبی (ﷺ)! آپ اپنی بیویوں، بیٹیوں اور تمام مؤمن عورتوں سے کہہ دیں کہ (جب وہ گھر سے باہر جائیں تو) اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں۔ اس سے وہ فوراً پہچان لی جائیں گی اور انہیں ستایا نہ جائے گا۔ اور اللہ بخشش کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

## فرمانِ نبویؐ پر سختی سے عمل پیرا ہونے والی

حضرت سودہ ؓ اور تمام ازواجِ مطہرات ۱۰ ہجری میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے گئیں۔ اس موقع پر آپؐ نے تمام ازواجِ مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اس حج کے بعد اپنے گھروں میں بیٹھنا''۔ چنانچہ حضرت سودہ ؓ اور حضرت زینب بنت جحش ؓ نے اس حکم پر سختی سے عمل کیا۔ دوسری ازواجِ مطہرات ادائے حج پر اس حکم کا اطلاق نہیں کرتی تھیں، لیکن حضرت سودہ اور حضرت زینب ؓ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ساری عمر گھر سے باہر نہ نکلیں۔ حضرت سودہ ؓ فرمایا کرتیں: ''میں حج اور عمرہ دونوں کر چکی ہوں، اب اللہ کے رسول کے حکم کے مطابق گھر سے باہر نہ نکلوں گی۔''

## حجِ بیت اللہ کے موقع پر ایک منفرد اعزاز

دس ہجری میں جب تمام ازواجِ مطہرات نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج پر گئیں، اس موقع پر بھی حضرت سودہؓ کو ایک اعزاز حاصل ہوا، جس کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ کاش مجھے بھی وہ اعزاز ملتا۔ اس بارے میں حضرت عائشہ ؓ ہی کی ایک روایت ملاحظہ ہو:

''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت سودہؓ نے مزدلفہ کی رات رسول اللہ ﷺ سے اجازت مانگی کہ وہ آپؐ سے پہلے منیٰ چلی جائیں اور لوگوں کے ہجوم سے پہلے نکل جائیں کیونکہ وہ بھاری بدن کی عورت تھیں۔ آپؐ نے حضرت سودہؓ کو اجازت دے دی

اور وہ آپؐ سے پہلے نکل گئیں ...... حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر میں بھی رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے لیتی جیسے حضرت سودہؓ نے اجازت لی تھی تو آپؐ کی اجازت سے جانا مجھے اُس چیز سے زیادہ پسند تھا جس سے میں خوش ہو رہی تھی۔'' (صحیح مسلم)

## بیٹے کی شہادت کا اعزاز

تمام ازواجِ مطہرات میں یہ واحد بلند ہمت خاتون ہیں جن کی زندگی میں ان کے بیٹے نے جامِ شہادت نوش کیا۔ نبی کریم ﷺ سے تو اِن کی کوئی اولاد نہیں ہوئی' جبکہ ان کے سابق شوہر حضرت سکرانؓ سے ان کا ایک بیٹا عبدالرحمٰنؓ تھا' جس کی پرورش اور تربیت بھی نبی اکرم ﷺ نے کی تھی۔ انہوں نے خلافت فاروقی میں ۱۶ھ میں جنگ جلولا میں جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ بھی حضرت سودہ کا ایک منفرد اعزاز ہے جو ان کے علاوہ کسی اور زوجہ کو حاصل نہیں۔

## حضرت سودہؓ: پانچ احادیث مبارکہ کی راویہ

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے پانچ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ایک صحیح بخاری میں اور چار احادیث کی باقی کتابوں میں ہیں۔

## حضرت سودہؓ کی وفات

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے' لیکن امام بخاری کے نزدیک آپؓ کی وفات ۲۲ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ آخری وقت میں انہوں نے اپنا حجرہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تھا۔

## اخذ و استفادہ

☆ صحاحِ ستہ کے علاوہ درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

☆ طبقات ابن سعد' حصہ ہشتم (اردو)
☆ تاریخ ابن کثیر' جلد اوّل (اردو)
☆ سیرت ابن ہشام' جلد دوم (اردو)
☆ اردو دائرہ معارف اسلامیہ' جلد ۱۱
☆ معارف الحدیث' جلد ۸
☆ ازواج مطہراتؓ از حافظ افروغ حسن
☆ الامین' از محمد رفیق ڈوگر
☆ پاک بیبیاںؓ از ڈاکٹر نذیر احمد پراچہ

# مسلم معاشروں میں مغربی استعمار سے پہلے خواتین کا چہرے کا پردہ

ڈاکٹر گوہر مشتاق (امریکہ)☆

جب چشمہ پہاڑ کے اندر سے نمودار ہوتا ہے تو اس کا پانی شفاف آئینے کی مانند ہوتا ہے‘ لیکن جب یہی صاف پانی نیچے کی جانب میدانوں اور زمینوں کی طرف بہتا چلا جاتا ہے تو راہ میں آنے والی گندگی اور غلاظت اُس پانی کو گدلا اور کیچڑ والا بنا دیتی ہے۔ جو لوگ اشیاء کو سطحی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں‘ وہ پانی کی آخری حالت کو دیکھ کر یہی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ پانی ابتدا سے ہی میلا کچیلا چلا آ رہا ہے۔ یہی مثال مسلمان خواتین کے چہرے کے پردے کے متعلق بھی صادق آتی ہے۔ چودہ سو سال پہلے اسلام کے صاف پانی کا چشمہ مکّہ مکرمہ کے پہاڑوں سے نکلا اور مشرق و مغرب کی طرف بہتا چلا گیا۔ اُس تمام دور میں اسلامی معاشروں میں جب بھی مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلتی تھیں تو چہرے کا پردہ کر کے نکلتی تھیں۔ تاہم جب یورپی استعماری قوتوں اور حکومتوں نے ۲۰۰ سال پہلے مسلمان ممالک میں اپنے پنجے گاڑے اور مسلمان ممالک کو غلام بنانا شروع کیا تو ان مغربی آقاؤں نے مسلمان عورت کے چہرے کے پردے کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ پھر مغرب کے جنسی انقلاب نے میڈیا کی پشت پناہی میں مسلم معاشروں کو متاثر کیا۔ مغربی آقاؤں نے زبردستی مسلمان خواتین کے چہروں سے نقاب نوچا تو میڈیا نے مسلمان خواتین کی برین واشنگ کے ذریعے انہیں برضا ورغبت بے پردہ ہونے پر اُکسایا۔ نتیجتاً پہلے نقاب مسلمان عورتوں کے چہروں سے غائب ہوا‘ پھر سر سے سکارف اور دوپٹہ اترا اور آخر میں ٹائیٹ جینز (Skinny Jeans) کی آمد سے ڈھیلے ڈھالے عبائے اور گاؤن غائب ہوئے۔ آج بعض روشن خیال مسلمان مفکرین مسلم معاشروں کو سطحی نگاہ سے دیکھ کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ مسلم معاشروں میں خواتین کی اکثریت

☆ای میل:gmushtaq2000@yahoo.com



اپنے چہرے نہیں چھپاتی تھی‘ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ یہ روشن خیال مفکرین سمجھتے ہیں کہ اسلام کا چشمہ ہمیشہ سے میلا کچیلا تھا‘ حالانکہ تاریخی ثبوت یہ بتاتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی تک مسلمان خواتین کی اکثریت چہرے کا پردہ کرتی تھی اور یہ ثبوت بالخصوص ہمیں مسلمان ممالک کی سیاحت کرنے والے غیر مسلم سیاحوں کی ڈائریوں اور سفرناموں (travelogues) سے ملتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ ’’روشن خیال مسلمان مفکرین‘‘ اگر ہمارے مسلمان علماء کی بات کا یقین نہ بھی کریں تو کم از کم غیر مسلم عیسائی سیاحوں کی بات کو تو وہ دقیانوسی کہہ کر رد نہیں کر سکتے۔

## مغربی استعمار اور مسلمان خواتین کا نقاب

جب تک مغربی نو آبادکار (Western Colonialists) نے مسلمان ممالک پر قبضہ نہیں کیا تھا‘ اس وقت تک مسلم خواتین اسلامی معاشروں میں بہت وقار اور عزت کے ساتھ چلتی پھرتی تھیں۔ نقاب مسلم خواتین کو نہ صرف مغربی نو آبادکاروں اور استعماری مردوں کی غلیظ نگاہوں سے بچاتا تھا بلکہ ان خواتین کو آزادی کا ایک احساس بھی دیتا تھا۔ غیر مسلم آقاؤں نے اس رکاوٹ کو تباہ کرنے کے لیے مسلمان خواتین کے چہروں سے نقاب اتروا دیا۔ بدقسمتی سے آج اکثر مسلمان بہنوں کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ ان سے کتنی قیمتی چیز چھینی جا چکی ہے جو ان کی بہت بڑی محافظ تھی۔

امریکہ کی نیویارک یونیورسٹی کا یہودی مفکر نیل پوسٹ مین اپنی کتاب Conscientious Objections میں لکھتا ہے:

> ’’ہر دور اپنے اندر ایک مخصوص سامراجی نظام رکھتا ہے اور اسی طرح ہر فاتح بھی سامراجی عزائم رکھتا ہے۔ اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں جب برطانیہ نے اس فن میں کمال حاصل کیا تو اس وقت کسی ملک پر حملہ کرنے کے لیے وہ پہلے اپنی بحری طاقت اور پھر عام فوج بھیجتے تھے۔ اس کے بعد انتظامیہ کے لوگ بھیجے جاتے تھے اور پھر آخر میں اپنا تعلیمی نظام اس ملک پر نافذ کرتے تھے۔‘‘(۱)

جب مغربی سامراج نے مسلمان معاشروں پر قبضہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ تقریباً تمام مسلمان خواتین جب گھروں سے نکلتیں تو اپنے چہروں کو چھپا کر نکلتیں۔ اپنی سامراجی طاقت اور کرائے کے روشن خیال علماء یعنی "Scholars for Dollars" (مثلاً قاسم الامین مصری یا محمد عبدہٗ وغیرہ) کو بڑی چالاکی کے ساتھ استعمال کر کے یورپی سامراجی ایجنٹوں نے مسلمان خواتین کے چہرے سے نقاب کو اتار پھینکا۔ مزید برآں‘ برطانوی سامراج نے مصر کی سیکولر

حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے وہاں کی جامعۃ الازہر کو ایک ماڈرنسٹ‘ روشن خیال اور معذرت خواہ ادارے میں تبدیل کر دیا۔ یہ کام حکومت مصر نے یونیورسٹی کی اہم پوزیشنوں بشمول شیخ الازہر کی پوزیشن کے لیے مغرب زدہ اور بعض حالات میں کرائے کے علماء (Scholars for Dollars) کو متعین کر کے کیا اور یہ چیز آج بھی وہاں پائی جاتی ہے۔ ایسے ’’ازہری‘‘ سکالر حضرات اپنی داڑھیاں شیو کرتے ہیں یا انتہائی چھوٹی داڑھیاں رکھتے ہیں‘ پبلک میں برملا موسیقی کی تعریف کرتے ہیں اور نقاب اور پردے کے خلاف فتوے دیتے ہیں یا عورتوں مردوں کے آزادانہ اختلاط کی اجازت دیتے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے تمام مسلمان ممالک میں خواتین گھر سے باہر نقاب لیا کرتی تھیں۔ وہ کسی ایک ملک یا خطے تک محدود نہ تھا۔ اندلس (مسلم سپین) جہاں کے مسلمان کئی لحاظ سے بہت ماڈرن تھے‘ لیکن اسلامی عالم ابوحیان توحیدی اندلس میں مسلمان عورتوں کے حجاب کے متعلق لکھتے ہیں:

وكذا عادة بلاد اندلس لا يظهر من المرأة الاعينها الواحدة (۲)

’’اور اسی طرح ملک اندلس کی خواتین کا یہ معمول ہے کہ ان کے جسم پر سے ان کی ایک آنکھ کے سوا کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔‘‘

## مسلمان عورتوں کے نقاب کے متعلق یورپین مہمانوں اور سیاحوں کی شہادتیں

آج سے تقریباً دو سو سال پہلے یورپی سیاحوں کو مشرقِ وسطیٰ پہنچ کر بہت مایوسی ہوا کرتی تھی‘ کیونکہ تقریباً سبھی مسلمان خواتین چہرے کا پردہ کیا کرتی تھیں۔ مزید برآں‘ مسلمانوں کے گھر یا پبلک مقامات پر کہیں بھی یورپی سیاحوں کے لیے یہ ممکن نہ ہوتا تھا کہ وہ مشرق کی خواتین کے حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔ یورپین سیاحوں کے مسلمان خواتین کے متعلق مشہور فرضی قصوں پر یہ ایک زوردار چوٹ تھی۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مؤرخ لیون مچل (Leon Michel) لکھتا ہے:

’’ہر یورپین مرد یہ سمجھتا ہے کہ جب وہ افریقہ (کے مسلمان ممالک) میں جائے گا تو اسے وہاں پر خوبصورت محل دکھائی دیں گے جب کہ بالکونی (Balcony) سڑک کی طرف کھلتی ہو گی جہاں ایک پرکشش قیدی (مسلمان عورت) کھڑی اس بات کا انتظار کر رہی ہو گی کہ کوئی بہادر فرانسیسی گھڑ سوار چمکیلی زرہ پہنے ہوئے آ کر اس کو آزاد کروا دے گا۔ یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے حرم (زنان خانے) بہت محفوظ ہوتے ہیں اور بالکونی پر لگی ہوئی لکڑی کی موٹی جالی (جسے عربی میں شناشیل یا



مشربیہ کہتے ہیں) اس بات کو ناممکن بنا دیتی ہے کہ باہر سے اندر کسی کی نظر پڑے یا گھر کے اندر کی عورت کو دیکھا جا سکے۔‘‘(۳)

کینیڈین نومسلم محقق خاتون کیتھرین بلوک (Katherine Bullock) نے اپنی کتاب Rethinking Muslim Women and the Veil میں یہ واضح کیا ہے کہ یورپ میں عورت اپنی قیمت کھو چکی تھی کیونکہ اس کا چہرہ کھلا تھا جس کے حسن سے پبلک لطف اندوز ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس اپنے چہرے پر نقاب ہونے کی وجہ سے مسلمان عورت ’’ایک قابل دید شے اور قیمتی متاع‘‘ کے طور پر دیکھنے والوں سے ابھی محفوظ تھی۔ اس وجہ سے‘ کیتھرین بلوک کے الفاظ میں:

*"The veil, and the women who wore it, became the metaphor for the entire East, and all that was both alluring and fearsome about it."* (۴)

’’نقاب اور اُس کو پہننے والی عورتیں‘ پورے مشرق کی علامت بن گئیں اور وہ سب کچھ جو یورپی لوگوں کے لیے پرکشش تھا یا جس سے وہ خوفزدہ تھے۔‘‘

چونکہ نقاب ان لوگوں کو مسلمان خواتین کے چہرے دیکھنے کے راستے میں رکاوٹ تھا اِس لیے بعض یورپی سیاحوں نے ’’نقاب‘‘ کو اپنے غضب کا نشانہ بنایا کیونکہ وہ اُن کی شہوت بھری نگاہوں (lustful eyes) کی راہ میں روک تھا۔ بریڈلے برٹ (Bradley-Birt) نامی ایک یورپی مصنف اپنی کتاب "Through Persia" میں برقعے اور نقاب پر ان الفاظ میں اپنا غصہ نکالتا ہے:

’’یہ (برقع اور نقاب) سب سے زیادہ ناشائستہ اور ناپسندیدہ لباس ہے جو سب سے زیادہ غیرت والے خاوندوں نے ایجاد کیا ہے۔ کوئی بھی اجنبی مرد ایرانی مسلمان خاتون کو نہیں دیکھ سکتا اور اُس خوبصورتی کو نہیں دیکھ سکتا۔ جو اِن برقعوں اور نقابوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے‘ جس حسن کا ہماری بہت سی نظموں میں ذکر ہے۔‘‘(۵)

اِسی طرح برطانوی سیاح چارلس ڈاوٹی (Charles Daughty) کو مسلمان خواتین کے نقاب سے اس لیے نفرت تھی کیونکہ اُس وجہ سے وہ مسلمان خواتین کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا‘ جن کے متعلق اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا:

*"The women's faces, which God created for the cheerfulness of the human world."* (۶)

"عورتوں کے چہرے جنہیں خدا نے اس لیے تخلیق کیا تھا کہ دنیا کے لوگ انہیں دیکھ کر لطف حاصل کریں۔"

دو صدیاں پہلے چہرے کا پردہ مسلمان معاشروں میں اتنا عام تھا کہ یورپین سیاح مسلمان خواتین کا چہرہ دیکھنے کے لیے سر پٹخ کر رہ جاتے تھے۔ جب انہیں راہ چلتی مسلمان خواتین کے چہرے دیکھنے میں کامیابی نہ ہوتی تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مکروفریب کا راستہ اختیار کرتے اور مختلف چالیں چلتے۔ مثال کے طور پر مسٹر ڈیولافوائے (Dieulafoy) اور اس کی بیوی جین ڈیولافوائے (Jane Dieulafoy) نے ۱۸۸۰ء کی دہائی میں مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا۔ اپنے سفرنامے میں جین بیان کرتی ہے کہ اُس نے اور اس کے خاوند نے اِس مسئلے کا حل ڈھونڈا:

"گھر کے صحن کے وسط میں گھر کا سربراہ بیٹھا ہوا دو جوان خواتین سے گفتگو میں مشغول تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ دونوں اس کی رشتہ دار تھیں۔ چونکہ ان (مسلمان) خواتین کو اس کا علم نہ تھا کہ انہیں دیکھا جا رہا ہے اِس لیے انہوں نے اپنے چہرے کھلے رکھے تھے...... میں دیوار کے پیچھے کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ جلدی سے مجھے کیمرہ پکڑائے تاکہ میں جلد از جلد ان کی تصویر کھینچ سکوں۔ میں اِس بات پر خوش تھی کہ میں نے کیمرے میں گھروں کے اندر کی اُس (انسانی) خوبصورتی کو محفوظ کرلیا ہے جس کی مشرقی حلقوں میں نہایت غیرت مندی کے سبب سے حفاظت کی جاتی ہے۔" (۷)

رابرٹ برٹن (Robert Burton) (۱۸۲۱ء-۱۸۹۰ء) ایک معروف برطانوی سیاح گزرا ہے' جس کا سب سے مشہور کام اُس کا مکہ اور مدینہ کا سفرنامہ ہے' جو اُس نے مسلمان کا بھیس دھار کر اُن دو مقدس مقامات کے سفر کے بعد لکھا۔ اِس سفرنامے کا عنوان تھا:

*"Personal narrative of a pilgrimate to al-Madinah and Meccah"*

اِس سفرنامے میں برٹن نے سرزمین عرب کے مسلمانوں کی نسلی جغرافیہ سے متعلق تحقیق (Ethmographic study) کی' اگرچہ اپنے بعض مشاہدات میں برٹن اسلام کے خلاف اپنے ذاتی تعصب کو چھپا نہ سکا۔ چونکہ مشرقِ وسطیٰ میں مسلمان خواتین چہرے کا پردہ کرتی تھیں اور پبلک مقامات پر مَردوں عورتوں کا آزادانہ اختلاط بھی نہیں ہوتا تھا اس لیے برٹن نے ایک "حکیم" کا روپ دھارا جو کہ حج کی غرض سے مصر کے دارالخلافہ قاہرہ سے مکّہ اور مدینہ کے



لیے سفر کرنے والا تھا۔ یہیں سے اُس کا سفرنامہ شروع ہوتا ہے۔ اپنے سفرنامے میں برٹن بتاتا ہے کہ اس نے "ایک مسلمان حکیم" کا روپ اس لیے دھارا کیونکہ اس بھیس میں اس بات کی گارنٹی تھی کہ وہ بعض مسلمان خواتین سے ملاقات کر سکے گا اور ان کے چہرے دیکھ سکے گا' کیونکہ مجبوری کی وجہ سے ان کو مرد حکیم کے پاس آنے کی اجازت مل جائے گی۔ اگرچہ برٹن کا سفرنامہ باپردہ مسلمان خواتین کے متعلق نفرت آمیز کلمات سے بھرا پڑا ہے' جو برٹن کے خبثِ باطن کا مظہر ہے' لیکن برٹن نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اسے مسلمان خواتین کے چہرے دیکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے۔ مثلاً مدینہ میں برٹن نے ایک مقامی شیخ کے گھر قیام کیا' لیکن برٹن نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اسے گھر کی خواتین کو دیکھنے کا کبھی موقع نہ مل سکا۔ (۸)

چارلس ڈاوٹی (Charles Doughty) (۱۸۴۳ء-۱۹۲۶ء) ایک اور برطانوی سیاح تھا جس نے سرزمین عرب کے بدوؤں کے ساتھ دو سال قیام کیا اور اپنے مشاہدات کو اپنی کتاب "Travels in Arabia Desert" میں محفوظ کیا۔ مسلمان خواتین جو کہ پبلک مقامات پر اور گھر سے باہر نقاب کیا کرتی تھیں' ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ڈاوٹی نے عرب نام "خلیل" اختیار کیا اور "حکیم" کا رُوپ دھارا۔ ڈاوٹی نے وہی حربہ استعمال کیا جو اس کے ہم وطن برٹن نے تقریباً ۲۷ سال پہلے کیا تھا۔ ڈاوٹی کو مسلم معاشرے میں غیر مخلوط محفلوں اور عورتوں کے چہرے کے پردے سے شدید نفرت تھی۔ اسلام کے چہرہ چھپانے کے حکم کے بارے میں اس نے جابجا اپنے سفرنامے میں نہایت گھٹیا اعتراضات کیے ہیں۔

ایک عرب شہر کا رہنے والا مسلمان اپنی والدہ کو اس کی آنکھوں کا علاج کروانے ڈاوٹی کے پاس لایا۔ ڈاوٹی بیان کرتا ہے کہ اُس بوڑھی خاتون نے اپنے چہرے سے نقاب اتارنے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ اس کے بیٹے نے اپنی ماں کو بہت کوشش کر کے سمجھایا کہ ڈاوٹی ایک حکیم ہے اس لیے اس کے سامنے چہرہ کھولنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اپنی کتاب میں ڈاوٹی اس بوڑھی عورت کے نقاب نہ اتارنے کے فوری رِدّعمل کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ اُس بوڑھی عورت کی کسی اجنبی مرد کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ تھا۔ اسی طرح ڈاوٹی کا سابقہ ایک نقاب اور برقعہ میں ملبوس مسلمان خاتون سے پیش آیا تو ڈاوٹی نے اس خاتون کے متعلق طنزیہ انداز میں لکھا:

"اس کا زنانہ چہرہ ایک "خستہ نقاب کے پیوند" سے چھپا ہوا تھا۔ ہماری نگاہوں میں یہ

ایشیا کے کافر لوگ ہیں! یہ عربوں کی نفیس عورتیں اپنے حرم (زنان خانے) میں رہتے ہوئے ناکارہ بن گئی ہیں...... یہ خواتین کے چہرے جو خدا نے دنیا کے لوگوں کے لطف اٹھانے کے لیے بنائے تھے' انہیں غیرت مندی کی ہولناکی میں جھونک دیا گیا ہے۔'' [۹]

ڈاؤٹی کے گھٹیا کلمات اور برٹن کے زہر آلود احساسات پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکہ کی ورمانٹ یونیورسٹی (University of Vermont) کی ماہرِ بشریات (Anthropologist) خاتون کیرول پاسٹنر (Carroll Pastner) نہایت منصفانہ انداز میں رقمطراز ہیں:

*"(Doughty and Burton) both fail ed to consider that one of the primary functions of the veil is to limit interaction between males and females to the immediate kin unit and to protect women from the gaze of the strangers."* [۱۰]

''ڈاؤٹی اور برٹن یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ نقاب کرنے کا ایک بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے آزادانہ گھلنے ملنے کو روکا جائے' سوائے قریبی ترین رشتہ داریوں کے' اور عورتوں کو اجنبی مردوں کی نگاہوں سے بچایا جائے۔''

ولیم رائی ولسن (William Rae Wilson, LLD) مشہور انگریز سیاح اور قانون دان گزرا ہے جس کی مختلف ممالک کے سفر کی دلچسپ روایات نے پورے یورپ میں کافی شہرت حاصل کی۔ ولیم رائی ولسن نے اپنے مشرقِ وسطیٰ کا سفر نامہ ۱۸۲۳ء میں لندن سے شائع کروایا جس کا عنوان تھا: "Travels in Egypt and the Holy Land" اپنی کتاب میں وہ اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

*"Women in Egypt are allowed to see no other persons at home than their families or relations, and when they do appear in the streets, their faces are completely veiled."* [۱۱]

''مصر میں خواتین کو اپنے گھر میں اپنے خاندان کے لوگوں یا رشتہ داروں کے علاوہ کسی کے سامنے آنے کی اجازت نہیں' اور جب وہ گھر سے باہر جاتی ہیں تو اپنے چہرے کا مکمل پردہ کرتی ہیں۔''

اِسی طرح عرب امریکی پروفیسر مارگوٹ بدران (Margot Badran) جو تحریک



نسواں کی بڑی علمبردار ہے' نے جب مصر کی تحریک نسواں کی بانی ھدیٰ شعراوی کی خودنوشت سوانح حیات کا دیباچہ لکھا تو اُس میں خود اعتراف کیا کہ مصر میں ماڈرن ازم آنے سے پہلے خواتین نقاب کرتی تھیں۔ وہ لکھتی ہے:

*"When (the women) went out they veiled their faces, thus taking thier secusion with them."* [۱۲]

''جب عورتیں گھر سے نکلتی تھیں تو چہرے کا پردہ کرتی تھیں' چنانچہ اس طرح سے وہ اپنی خلوت نشینی کو اپنے ساتھ لے کر نکلتی تھیں۔''

اِن تمام سفرناموں' ڈائریوں اور روئیدادوں سے ہم کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں؟ یورپین سیاحوں اور مہمانوں (مرد اور عورتوں) کی دی گئی تفصیلات اس بات کا واضح ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ دو صدیوں پہلے تک مسلمان معاشروں میں تقریباً تمام مسلمان خواتین چہرے کا پردہ کیا کرتی تھیں۔ عربی کا ایک محاورہ ہے: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ ''حقیقی فضیلت وہ ہوتی ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کریں''۔ دو صدیوں پہلے تک مسلمان خواتین ایسا بے مثال پردہ کیا کرتی تھیں کہ جس کی شہادت دشمنوں نے بھی دی ہے۔

## نقاب چھین کر مسلمان خواتین کی قوتِ مزاحمت کو توڑنا

مسلمان خواتین کے چہروں سے نقاب اُسی دور میں میں غائب ہوا تھا جس دور میں مغربی استعمار نے مسلمان ممالک کو غلامی کے شکنجے میں جکڑا۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں بلکہ اس کے پیچھے نہایت گہرے نفسیاتی عوامل کارفرما ہیں۔ فرینٹز فینن (Frantz Fanon) فرانس کا ایک ماہر نفسیات اور فلسفی گزرا ہے جو کہ نو آبادیات کے اثرات پر تحقیق کے میدان (post-colonial studies) میں بہت صاحبِ اثر تھا' بلکہ استعمار کی نفسیاتی بیماریوں کے اثرات (psychopathology of colonialism) کے میدان میں شاید وہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا مفکر گزرا ہے۔ اس کی تصنیفات سے مغربی استعمار کے خلاف آزادی کی تحریکوں نے دنیا میں تقریباً چار دہائیوں تک گہرا اثر لیا۔ اپنی مشہور زمانہ کتاب "Dying Colonialism" میں فینن نے یورپی استعمار کے دوران الجزائر کی مسلمان خواتین کے نقاب کے متعلق لکھا:

*"Every rejected veil disclosed to the eyes of the colonialists horizons until then forbidden, and*

*revealed to them, piece by piece, the flesh of Algeria laid bare. The occupier's aggressiveness, and hence his hopes, multiplied ten-fold each time a new face was uncovered. Every new Algerian woman unveiled announced to the occupier an Algerian society whose systems of defense were in the process of dislocation, open and breached. Every veil that fell, every body that became liberated from the traditional embrace of the haïk, every face that offered itself to the bold and impatient glance of the occupier, was a negative expression of the fact that Algeria was beginning to deny herself and was accepting the rape of the colonizer."* (۱۳)

’’ہر اُترا ہوا نقاب استعماری طاقتوں کی آنکھوں کو وہ اُفق دکھاتا تھا جو ابھی تک ان کی نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے اور تھوڑا تھوڑا کر کے الجزائر کا جسم بے پردہ ہو رہا تھا۔ ہر دفعہ جب کسی مسلمان عورت کا چہرہ بے نقاب ہوتا تو فاتح کی جارحیت اور اس کی امیدیں دس گنا بڑھ جاتیں۔ جب بھی کسی نئی الجزائری عورت کے چہرے سے نقاب اترتا تو فاتح قوم کے لیے یہ اعلان ہوتا کہ اب الجزائر کی سوسائٹی کے دفاعی نظام کمزور ہو رہے ہیں اور اُن میں مداخلت کی جا رہی ہے۔ ہر نقاب کے بغیر چہرہ جو اپنے آپ کو فاتح قوم کے مَردوں کی نڈر اور بے صبری نگاہوں کے سامنے پیش کرتا تھا‘ وہ اس حقیقت کا منفی اظہار تھا کہ الجزائر نے اپنی شناخت کا انکار شروع کر دیا ہے اور اس نے فاتح کی عصمت دری کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔‘‘

فرانسیسی مؤرخ فینن کے مطابق جب استعماری طاقتوں نے مسلمان عورتوں کے نقاب زبردستی اتروائے یا نام نہاد آزادی کا جھانسہ دے کر انہیں بے نقاب کیا تو دونوں صورتوں میں نوآبادکاروں (colonialists) کو فتح مندی کا احساس ہوتا تھا‘ کیونکہ اِس سے انہیں پتا چلتا تھا کہ مسلمان معاشرے کا نظامِ دفاع بتدریج کمزور ہو رہا ہے۔

مسلمان عورتوں کا نقاب استعماری طاقتوں کے خلاف مزاحمت کا نشان تھا۔ باپردہ مسلمان عورت نوآبادکاروں کے لیے مایوسی کا پیغام تھی‘ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایسی عورت کے سامنے



بے بس محسوس کرتے تھے جسے وہ مفتوح قوم ہونے کی حیثیت سے اپنی ملکیت سمجھتے تھے لیکن اسے دیکھ نہ سکتے تھے۔ باپردہ خواتین اپنے آپ کو فاتحین کے سامنے نمائش کے لیے پیش نہیں کر رہی تھیں۔ یورپی استعماری قومیں اس اعتماد کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ پر قابض ہوئی تھیں کہ وہ مسلمانوں سے اعلیٰ ہیں لیکن یہاں پہنچ کر ان کا اپنا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ یورپی فاتحین کے لیے مسلمان عورت کو اپنے گھر سے اور نقاب سے باہر لانے کا مطلب اس کی مزاحمت کو توڑنا تھا اور یہ اس عورت پر قبضہ حاصل کرنے کے مترادف تھا‘ جیسا کہ فینن رقمطراز ہے:

*"Unveiling this [Muslim] woman is revealing her beauty; it is barring her secret, breaking her resistance, making her available for adventure. Hiding the face is also disguising a secret; it is also creating a world of mystery, of the hidden. In a confused way, the European experiences his relation with the Algerian woman at a highly complex level. There is in it the will to bring this woman within his reach, to make her a possible object of possession. This woman who sees without being seen frustrates the colonizer. There is no reciprocity. She does not yield herself, does not give herself, does not offer herself."* (۱۴)

’’مسلمان عورت کو بے نقاب کرنے کا مطلب اس کے حسن کو ظاہر کرنا تھا‘ اس کے راز کو افشا کرنا تھا‘ اس کی مزاحمت کو توڑنا تھا اور اسے فاتحین کی مہم جوئیوں کے لیے دستیاب بنانا تھا۔ چہرے کو چھپانا اسی طرح ہے کہ کسی نے کوئی راز چھپایا ہو‘ یہ غیب کی دنیا بنانے کی طرح ہے۔ کنفیوز انداز میں یورپین شخص کو سمجھ نہیں آتی کہ اس کا الجزائر کی خواتین سے کس قسم کا تعلق ہے۔ اس کے اندر اس کی یہ خواہش پوشیدہ ہے کہ وہ کسی طرح باپردہ مسلمان عورت کو اپنی دسترس میں لا سکے۔ یہ مسلمان عورت جو کہ خود تو نقاب میں سے دیکھتی ہے لیکن دوسرے اسے نہیں دیکھ سکتے‘ یہ چیز نوآبادکار (Colonizer) کو بہت مایوس کرتی ہے۔ یہاں پر برابری نہیں ہے۔ باپردہ مسلمان عورت اپنے آپ کو فاتح کے حوالے نہیں کرتی‘ اپنے آپ کو پیش نہیں کرتی۔‘‘

الجزائر اور بہت سے دیگر مسلمان ممالک کی خواتین کے لیے حجاب اور نقاب ان کی شناخت تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں شاہِ ایران کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کئی سیکولر اور ماڈرن خواتین نے بھی حجاب پہنے۔ یہی چیز مصر میں الاخوان المسلمون اور دیگر جماعتوں نے دہرائی۔ مصر کی مفکر خاتون سفینا زکاظم جو کہ تحریک نسواں کی علمبردار ہے لیکن مذہب کے لیے بھی دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے، وہ ان مصری خواتین میں سے ایک ہے جنہیں شروع میں مغرب کی ماڈرن ازم کی لہر اپنے ساتھ بہالے گئی۔ یہ دور تقریباً نصف صدی تک رہا۔ جس دور میں مغربی لباس اونچی سوسائٹی اور معیارِ زندگی (high status) کی علامت سمجھا جاتا تھا، جبکہ نقاب اور برقعے کو تحقیر کے ساتھ علاقائی چیز ''بلدی'' سمجھا جاتا تھا۔ آج سفینا زکاظم ''حجاب'' کو اپنی شناخت اور اپنی ''اصل اسلامی روایت کی طرف واپسی'' کی علامت (Going back to Islamic roots) سمجھتی ہیں۔ مصری اخبار ''الاحرام'' کے جنوری ۲۰۰۷ء کے شمارے میں ایک انٹرویو میں انہوں نے بیان کیا:

''ممکن ہے کہ خواتین کے نقاب کی طرف واپس لوٹنے کی دوسری وجوہات بھی ہوں، لیکن اِس میں شک نہیں کہ اسلامی لباس کا اس طرح پھیل جانا مذہبیت کی نشانی ہے۔'' (۱۵)

سفینا زکاظم مصر کی پہلی صحافی خاتون تھیں جنہوں نے ۱۹۷۰ء کی سیکولر دہائی میں حجاب لینا شروع کیا۔ ان کے الفاظ میں:

''ہمیں اچانک اس بات کا احساس ہوا کہ ہماری اسلامی روایات کو ہم سے چھین لیا گیا ہے اور ہم نے اپنی جڑوں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ میری حیثیت ایک غصب شدہ زمین کی سی تھی۔ اور جس دن میں نے حجاب لینا شروع کیا (۱۹۷۲ء میں) وہ دن میری آزادی کا دن تھا۔''

بلاشبہ آج بھی مسلمان خواتین کا حجاب اور نقاب، ظلم اور آمریت کے خلاف مزاحمت کی علامت ہے۔ برطانوی اخبار "The Guardian" میں سابقہ برطانوی راہبہ (British Nun) اور عیسائی سکالر کیرن آرمسٹرانگ (Karen Armstrong) نے اپنے ہم مذہبوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا:

''مسلمان خواتین سے حجاب اور نقاب اتار دینے کا مطالبہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بعض خواتین اس لباس کو پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ پکڑے رکھیں گی۔ وہ لباس جو



آج ظلم وستم کے خلاف مزاحمت کی علامت ہے۔'' (بحوالہ: ایضاً)

یورپی استعماری طاقتوں نے یہ بہانہ تراشا کہ وہ مسلمان خواتین کے حجاب اتار کر انہیں آزادی دلانا چاہتے ہیں، حالانکہ ان سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اگر وہ مسلمان خواتین کے اتنے ہی خیر خواہ تھے تو انہوں نے مسلمان ممالک کو غلام کیوں بنایا؟ انہوں نے مغلوب مسلمان ممالک پر اپنا مغربی نظام تعلیم ٹھونسا اور ماڈرن ازم کی آڑ میں مسلم خواتین کی شرم و حیا اور نسوانیت کا خون کیا۔ مغربی استعمار کے مذہبی کارندے یعنی عیسائی مشنریوں کا اولین نشانہ بھی مسلمان مائیں تھیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں کام کرنے والے ایک نامور مشنری سیموئیل زویمر (Samuel Zwemer) نے اپنی کتاب "Moslem Women" (مطبوعہ امریکہ، ۱۹۲۶ء) میں یہ دعویٰ کیا تھا:

''چونکہ یہ حقیقت ہے کہ ماں کا اپنے بچوں، لڑکوں اور لڑکیوں دونوں پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور ایمان اور مذہبی عقائد کے دفاع کے معاملے میں خواتین زیادہ ڈٹ جانے والی ہوتی ہیں، اس لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ مشنری اداروں کو یہ چاہیے کہ وہ مسلمان خواتین کو بدلنے کے لیے زیادہ کام کریں تاکہ اس ذریعے سے مسلمان ممالک کو عیسائی بنانے کا عمل تیز کیا جاسکے۔'' (۱۶)

زویمر اور وین سومر (Van Sommer) کے مطابق مسلمان ممالک میں کام کرنے والے بعض مشنری سکول تو اِس حد تک چلے گئے کہ مشنری سکولوں کے اساتذہ مسلمان لڑکیوں کو اپنے والدین اور مذہبی اَقدار کے خلاف ورغلانے کی کوشش کرتے اور حجاب پہننے سے انکار کرنے کی انہیں ترغیب دیتے۔ (۱۷)

ظاہر ہے کہ مسلمان خواتین کا پردہ اور مسلمان گھروں کے حرم (زنان خانے) پادریوں کے مشنری کام میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چنانچہ مغربی استعماری ایجنٹوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ مسلمان عورت کی مزاحمت کو توڑنے کے لیے اس کا نقاب اتروایا جائے چاہے اسے آزادیٔ نسواں کا جھانسہ دے کر، یا زبردستی، بلکہ ہر ممکن طریقے سے۔

## مسلم ممالک میں نقاب کے خلاف صلیبی جنگ

جیسا کہ ہم نے یورپ کے سیاحوں اور مسلمان ممالک کا سفر کرنے والے مسافروں کے بیانات میں دیکھا کہ دو صدیاں پہلے وہاں تقریباً تمام خواتین گھر سے باہر چہرے کا پردہ کیا کرتی

تھیں۔ پھر دو تین نسلیں گزرنے کے بعد آج مسلمانوں کا یہ حال ہوگیا ہے کہ چہرے کے پردے کو صرف ایک نفلی عمل سمجھا جاتا ہے جو کہ مسلمان خواتین کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔ اس کی پہلی وجہ غیروں کی زبردستی تھی‘ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوا کہ کس طرح مغربی استعمار نے مسلمان عورت کو بے پردہ کیا۔ اس کی دوسری بڑی وجہ اپنے منافقوں کی عیاری اور مسلم کی سادگی تھی: ع ’’سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ!‘‘

مسلم ممالک پر جب مغربی استعمار کا سیلاب آیا اور انہیں اپنا غلام بنایا تو مسلم ممالک میں مختلف جگہوں پر ماڈرنسٹ مصلحین اور روشن خیال معذرت خواہوں نے سر اٹھانا شروع کیا‘ جس طرح بارش کے بعد خود رو پودے سر اٹھاتے ہیں۔ مصر کی ہدیٰ شعراوی اور سیزی نبراوی ۱۹۲۳ء میں روم سے آزدیٔ نسواں کی مغربی کانفرنس (International Women's Alliance Conference) میں حاضری دے کر جب مصر واپس آئیں تو مدینہ کے منافق اعظم عبداللہ بن اُبی کی جانشینی کا ثبوت دیتے ہوئے نہایت ڈرامائی انداز میں ٹرین سے اترتے ہوئے اپنے نقاب اتار کر دُور پھینک دیے۔ اسی دور میں مصر کی صفیہ زغلول نے ایک پبلک تقریر میں اپنے نقاب کو آگ لگائی۔ یہ مسلمان ممالک میں خواتین کے بے پردہ چہروں والے کلچر کی ابتدا تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب ترکی کے ڈکٹیٹر (اور پاکستان کے ’’روشن خیال‘‘ آمر پرویز مشرف کے روحانی باپ) مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کی باپردہ خواتین کو مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا۔ اتاترک کی بیوی لطیف ہنیم (Latife Hanim) اپنی شادی کی تقریب میں بے پردہ ہو کر مکمل طور پر مغربی لباس میں آئی تھی اور اس کے بعد تمام عوامی تقریبات میں ہمیشہ بے پردہ حالت میں شرکت کرتی تھی۔

اسی طرح افغانستان کی ملکہ ثریا ۱۹۲۸ء میں مغربی لباس میں پبلک کے سامنے آئی جبکہ افغانستان کے بادشاہ نے پردے کو ختم کرنے کی مہم چلائی۔ (۱۸)

۱۹۳۶ء میں ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی نے نقاب پہننے کو خلافِ قانون قرار دے دیا اور اس کی بیویاں پبلک میں بے پردہ حالت میں آنا شروع ہوگئیں۔ ایران میں شاہ کے حکم کے تحت ٹیکسی ڈرائیوروں کو حکومت جرمانہ کرتی اگر وہ برقعے والی عورت کو اپنی گاڑی پر سوار کرتے۔ رضا شاہ نے نہ صرف سکولوں کالجوں میں برقعے اور نقاب پر پابندی لگادی تھی بلکہ اس ’’روشن خیال‘‘ بلکہ تاریک خیال بادشاہ نے یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ کسی بھی پبلک ہسپتال یا



کلینک میں برقعے والی عورت کو علاج نہ مہیا کیا جائے۔ (بحوالہ ایضاً)

مغربی بے حیا لباس کی محبت اور نقالی میں رضا شاہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے ایران کی مملکت میں پولیس کو ہدایات جاری کی تھیں کہ اگر وہ کسی مسلمان عورت کو پبلک مقامات پر باپردہ حالت میں دیکھیں تو اس کا نقاب اتار کر قینچی سے کاٹ ڈالیں۔ (۱۹)

عجیب بات ہے کہ اس دور میں اگر کوئی مسلمان عورت گلیوں سڑکوں پر تیراکی کے لباس (Bikinis) میں گھومتی تو حکومتوں کو کوئی اعتراض نہ تھا‘ لیکن اگر مسلمان عورت برقعے اور نقاب میں گھر سے باہر قدم رکھتی تو ان عورتوں کے جسم کے سوداگروں کو شدید تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔

پھر بہت جلد ہی روشن خیال اور ماڈرنسٹ مسلمان سکالروں نے میڈیا‘ استعماری حکومتوں اور تحریک نسواں کی علمبردار خواتین کے پریشر کے سامنے ہتھیار پھینک دیے اور ایسے فتوے دینے شروع کر دیے کہ نقاب تو صرف نبی اکرم ﷺ کی بیویوں تک محدود تھا اور مسلمان سوسائٹی کی عام خواتین نے تو نقاب کبھی پہنا ہی نہیں تھا۔ اِس دور میں مصر کی مذہبی درسگاہ جامعۃ الازہر‘ جس کی سربراہی محمد عبدہ‘ جیسے معذرت خواہ علماء کر رہے تھے‘ نے مسلمان خواتین کے لیے پبلک میں چہرے کھلے رکھنے کا فتویٰ جاری کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں‘ کیونکہ جب سے برطانیہ نے مصر پر قبضہ کیا اور اس کے بعد سے مصر کا ڈکٹیٹر جامعۃ الازہر کے شیخ کا چناؤ اپنے ’’مبارک‘‘ ہاتھوں سے کرتا ہے‘ اس وقت سے جامعۃ الازہر نے موسیقی‘ داڑھی منڈانا‘ عورتوں کا انگریزی لباس پہننا وغیرہ جیسے بے شمار مسئلوں کے حلال ہونے کے فتوے جاری کیے ہیں۔ اس وقت کے ازہری سکالرز (scholars for dollars) کا واحد مقصد لارڈ کرومر (Lord Cromer) کو خوش کرنا تھا جو کہ مصر میں برطانیہ کی طرف سے حکمران تھا۔ نقاب کے خلاف صلیبی جنگ آج بھی مسلمان ملکوں میں جاری ہے (ہم فرانس میں نقاب پر پابندی کا کیا افسوس کریں کہ انہوں نے اِس کے خلاف فتویٰ مصر کے منافق اعظم شیخ الازہر طنطاوی سے ہی تو لیا تھا)۔ پھر ۱۹۹۲ء میں ایک کویتی میڈیکل کالج کی پرنسپل نے کالج کی طالبات کے نقاب پہننے پر پابندی لگادی تھی۔ (۲۰)

ترکی میں ۱۹۸۸ء میں ایک عدالتی فیصلے نے ۱۹۸۰ء کے لباس کے قانون کو قائم رکھا جس کے مطابق تمام حکومتی محکموں میں کام کرنے والی خواتین کو سر پر سکارف لینے یا نقاب پہننے

کی ممانعت کی گئی ہے۔[۲۱]

کتنے تعجب کی بات ہے کہ آج اگر افغانستان میں یا مالی میں یا صومالیہ میں مسلمان خواتین کو پردے کے اسلامی حکم پر عمل کرنے کا کہا جاتا ہے تو پوری دنیا کا مغرب کا کنٹرول شدہ میڈیا غضب ناک ہو جاتا ہے' لیکن جب مسلمان ممالک میں خواتین کے چہروں سے زبردستی نقاب اُتارے جاتے ہیں تو یہی سیکولر اور آزاد خیال میڈیا گونگا بن جاتا ہے۔ دراصل یہی روشن خیال (منافق) مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دجالی میڈیا کی منافقت ہے۔ سچ کہا گیا ہے کہ ہر منافق' کافر ہوتا ہے اور ہر کافر' منافق ہوتا ہے۔

(نوٹ: زیر نظر مضمون ڈاکٹر گوہر مشتاق کی کتاب ''پردہ: عقلمند خواتین کا انتخاب' مطبوعہ مکتبہ خواتین میگزین' لاہور'' سے لیا گیا ہے اور مصنف کی خواہش پر شائع کیا جارہا ہے۔)

## حواشی


(1) Postman, Neil (1992). *Conscientious Objections: Stirring up Trouble about Language, Technology and Education.* New York, Vintage.

(۲) البحر المحیط' ابو حیان توحیدی' جلد ۷' صفحہ ۲۵۰

(3) Michel, Leon (2010) *Tunis [1883]. (French edition)* Montana (USA), Kessinger Publishing.

(4) Bullock, Katherine (2002) *Rethinking Muslim Women and the Veil.* Virginia, IIIT.

(5) Bradley-Birt,, F.T., *Through Persia [1909]*, quoted in Bullock, Katherine (2002) *Rethinking Muslim Women and the Veil.*

(6) Pastner, C. M. (1978). "Englishmen in Arabia: Encounters with Middle Eastern Women." *Signs: Journal of Women in Culture and Society* 4(2): 309-323.

(7) Graham-Brown, sarah. *Images of Woman: The portrayal of Women in Photography of the Middle East, 1860-1950* [London: Quartet Books, 1988]

(8) Burton, Sir Richard F. (1964). *Personal Narrative of a Pilgrimage to al-Madinah and Meccah* New York, Dover





Publications.

(9) Doughty, Charles M. (1936). *Travels in Arabia Desert* with an introduction by T.E. Lawrence, New York, Jonathan Cape, Ltd.; first published in 1888)

(10) Pastner, C. M. (1978). "Englishmen in Arabia: Encounters with Middle Eastern Women." *Signs: Journal of Women in Culture and Society* 4(2): 309-323.

(11) William Rae (1824). *Travels in Egypt and the Holy Land: With A Journey Through Turkey, Greece, The Ionian Isles, Sicily, Spain, Etc.* Whitefish (Montana, U.S.A.), Kissinger Publishing, LLC. (re-published in year 2008)

(12) Badran, Margot, 'Introduction', *Harem years: The Memoirs of an Egyptian Feminist (1879-1924)* London, Virago, 1986) .

(13) Fanon, F. (1965). *Dying Colonialism.* New York, Grove Press, Inc. (translated from French by Haakon Chevalier)

(14) بحوالہ: ایضاً

(15) Shahine, Gihan (11 - 17 January 2007). *A witch-hunt for our times?* Al-Ahram Weekly.

(16) Zwemer, S.M. (1926) *Moslem Women* West Medford, Mass., Central Committee of the United Study of Foreign Missions)

(17) Van Sommer, Annie & Samuel M. Zwemer (eds.), (1907) *Our Moslem Sisters* New York, The Young People's Missionary Movement)

(18) Jayawardena, Humari (1986) *Feminism and Nationalism in the Third World* London, Zed Books

(19) Givechian, Fatemeh. (1991). "Cultural Changes in Male-Female Relations." *Iranian Journal of International Affairs* 3(3):521-530 .

(20) Goodwin, Jan. (1994) *Price of Honor* . New York, Plume Publishers.

(21) Adnan-Unat (1991) *Women in Middle Eastern History* Nikki Keddie & beth Baron (New Haven, Yale Univ.)

# یہودیت کی بنیاد اور مختصر تاریخ

## اللہ کے چہیتے اور لاڈلے ہونے کی دعویدار قوم
## کے عروج وزوال کی مختصر داستان

تحریر: انجینئر محمد عامر یٰسین

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کو جب اس زمین میں بھیجا تو نسلِ آدم کی جسمانی ضروریات کا سامان اسی زمین کے اندر رکھ دیا۔ انسان نے اپنے حواسِ خمسہ اور عقل وشعور کے استعمال سے بخوبی اس زمین سے فائدہ اٹھانا سیکھا۔ لیکن ایک سوال جو ہر انسان کے ذہن میں موجود ہوتا ہے کہ مجھے کس نے اور کیوں تخلیق کیا؟ اس سوال کے جواب کے لیے اللہ نے انہی انسانوں میں سے انبیاءؑ کو مبعوث فرمایا۔ چنانچہ پہلے انسان (حضرت آدم علیہ السلام) ہی کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ احادیث کے مطابق کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے گئے اور زمین میں کوئی بستی ایسی نہیں جس کی طرف اللہ نے کوئی نبی مبعوث نہ فرمایا ہو۔ قرآن نے جابجا مختلف انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی قوموں کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کا اسلوب ہے کہ تنبیہ کے لیے انسانی فطرت کے عین مطابق واقعات کا سہارا لیا گیا ہے۔ سابقہ امتوں کے عروج وزوال کی مختصر روداد بیان کی گئی اور ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٣٧﴾﴾ (آل عمران)

''تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں، تو تم زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا!''

انہی سابقہ اقوام میں سے جس قوم کا تذکرہ قرآن میں سب سے زیادہ وارد ہوا وہ قوم بنی اسرائیل ہے۔ بنی اسرائیل کی طرف اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو اس طرح تسلسل کے ساتھ بھیجا کہ نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں۔ ان کے درمیان ایک وقت میں کئی کئی نبی بھی موجود رہے ہیں۔



حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَاءِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ ، وَاِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ ، وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُوْنَ)) (متفق علیه)

''بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کے ہاتھ میں تھی، جب بھی ایک نبی کا انتقال ہوتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی لے لیتا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفاء ہوں گے جو بہت سے ہوں گے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء کہا جاتا ہے، کیونکہ آپؑ کے بعد آنے والے تمام نبی آپؑ ہی کی نسل میں سے ہیں۔ آپؑ کا آبائی علاقہ بابل (موجودہ عراق) ہے۔ آپؑ کی اولاد مختلف مقامات کی طرف ہجرت کر گئی۔ آپؑ کی تین ازواج سے تین نسلیں چلیں۔ حضرت حاجرہ کے بیٹے اسماعیلؑ کی نسل سے امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام مکہ میں قیام پذیر ہوئے۔ حضرت قطورہ کی نسل (جسے بنی قطورہ کہتے ہیں) سے حضرت شعیب علیہ السلام تھے جو مدین کی طرف مبعوث ہوئے۔ جبکہ حضرت سارہ کے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں۔ حضرت اسحٰقؑ کنعان (فلسطین) منتقل ہو گئے۔ بائبل کے مطابق اسحٰقؑ کے دو بیٹے تھے: عیسو اور یعقوبؑ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی نام ''اسرائیل'' ہے، جو اسراء (بندہ) اور ایل (اللہ) سے بنا ہے، یعنی ''اللہ کا بندہ''۔ ان کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام نے سب سے پہلے بیت المقدس کی تعمیر کی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے وجود میں آئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام جب عزیز مصر کے عہدے پر متمکن ہوئے تو یعقوبؑ اپنے باقی بیٹوں کے ساتھ مصر منتقل ہو کر یہاں قیام پذیر ہوئے۔ (حضرت یوسفؑ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے۔) شاہی خاندان سے تعلق کی بدولت بنی اسرائیل مصر میں خوب پھلے پھولے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تو اُس وقت مصر میں قبطیوں کی حکومت تھی، جس کا سربراہ ''فرعون'' کہلاتا تھا۔ قبطیوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنایا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمایا اور آپؑ کو تورات عطا فرمائی۔ نیز آپ کو تقویت دینے کے لیے ہارون علیہ السلام کو آپ کا مشیر بنایا۔ آپؑ کی بعثت کا ایک مقصد بنی اسرائیل کو قبطیوں کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ جب اُس وقت کے فرعون کو علم ہوا کہ بنی اسرائیل موسیٰؑ کی سرکردگی میں راتوں رات مصر سے ہجرت کر رہے ہیں تو اُس نے ان کا

پیچھا کیا اور سمندر میں غرق ہوا۔ اُس نے چونکہ خدائی کا دعویٰ کیا تھا اس لیے اللہ نے اس کی لاش کو آنے والوں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔ یہ آج بھی مصر کے ایک عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ سورۂ یونس میں اس فرعون کی لاش کے حوالے سے ارشاد ہے:

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿٩٢﴾﴾

’’پس آج ہم تیری لاش کو (سمندر سے باہر پھینک کر) بچالیں گے تاکہ تو بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائے۔ اگرچہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غافل رہتے ہیں۔‘‘

فرعون سے خلاصی کے بعد بنی اسرائیل صحرائے سینا میں اترے۔ کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے اَحکامِ عشرہ (Ten Commandments) عطا کیے گئے:

(۱) میں (یعنی اللہ) تمہارا خدا ہوں جس نے تمہیں مصر کی زمین سے نکالا۔ (۲) ایک خدا کی عبادت کرو جس کا کوئی شریک نہیں۔ (بنی اسرائیل میں اللہ کے لیے ’’یہوہ‘‘ (yahweh) کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔) (۳) اللہ کے نام کی جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ۔ (۴) سبت (ہفتہ) کے دن کا احترام بجالاؤ۔ (۵) والدین کا احترام کرو تاکہ ان کی عمر لمبی ہو جو دنیا میں انہیں عطا کی گئی۔ (۶) قتل نہ کرو۔ (۷) زنا نہ کرو۔ (۸) چوری نہ کرو۔ (۹) کسی دوست کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دو۔ (۱۰) اپنے پڑوسی کی ملکیت پر نظر نہ رکھو۔

صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کی دلجوئی کے لیے اللہ تعالیٰ نے من وسلویٰ عطا کر کے ان کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا۔ ابر ان پر سایہ کرتا۔ بارہ قبیلوں کے لیے الگ الگ بارہ چشمے جاری کر دیے گئے۔ (قرآن میں جابجا ان نعمتوں کا تذکرہ ملتا ہے) لیکن ان سب نعمتوں کے باوجود جب ان کو فلسطین میں داخلے کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا (جس کی فتح کی ان کو بشارت بھی تھی) تو انہوں نے دوٹوک انکار کر دیا، جس کی پاداش میں وہ چالیس سال تک صحرا میں بھٹکتے رہے۔ اسی دوران حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا انتقال ہوگیا۔ بنی اسرائیل کی نئی نسل جب جوان ہوئی تو انہوں نے حضرت یوشع بن نون کی سرکردگی میں فلسطین پر حملہ کیا اور یہاں اپنی حکومت قائم کی۔

بنی اسرائیل نے فلسطین میں ایک مضبوط مملکت قائم کرنے کی بجائے بارہ ریاستیں قائم کیں۔ ان ریاستوں کی آپس کی لڑائیوں نے اردگرد کی اقوام کو ان پر چڑھائی کا موقع دیا۔ فلسطین میں آباد قوم ’’عمالقہ‘‘ نے ان پر حملہ کر دیا اور ان کو بے دریغ قتل کیا۔ عمالقہ جاتے ہوئے ’’تابوتِ سکینہ‘‘ بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ تابوتِ سکینہ (Ark of the covenant) لکڑی



کا ایک صندوق تھا، جس کے اندر بنی اسرائیل کے تبرکات موجود تھے، جو کہ ان کی دلجوئی کا باعث تھے۔ ’’سکینہ‘‘ کا مطلب ہے سکون دینے والا۔ روایت ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے زیر استعمال چیزیں مثلاً عصائے موسیٰؑ، مَن وسلویٰ کا برتن، تورات کی تختیاں جو کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھیں، وغیرہ موجود تھیں۔ اس واقعے سے شدید غمزدہ ہو کر بنی اسرائیل نے اُس وقت کے نبی حضرت سموئیلؑ سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کیا جائے تاکہ وہ جہاد کر سکیں۔ (سورۃ البقرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ آیات ۲۴۶ تا ۲۵۱)

حضرت طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ اسی دوران تابوتِ سکینہ بھی واپس مل گیا۔ فلسطین کا بادشاہ اُس وقت جالوت تھا۔ طالوت نے جالوت کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ اس جنگ میں جالوت حضرت داوٗد علیہ السلام کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ طالوت نے اس سے خوش ہو کر حضرت داوٗد علیہ السلام کو اپنا داماد بنالیا۔ بنی اسرائیل کی راہ نمائی کے لیے حضرت داوٗد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زبور عطا کی، جو حمدیہ ترانوں پر مشتمل تھی۔ نیز اس میں تورات کے احکامات کا تسلسل تھا۔ حضرت داوٗد علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلافت عطا کی۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ’’اے میرے رب! مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو میسر نہ ہو‘‘۔ ان کی دعا قبول ہوئی اور ان کو چرند، پرند، درند حتیٰ کہ جنوں اور آبی مخلوقات پر حکومت عطا ہوئی۔ ان کو جانوروں کی بولیاں سمجھ آتی تھیں اور ہوا ان کے لیے مسخر کر دی گئی، جس کے سبب وہ مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرتے تھے۔ آپؑ نے بیت المقدس کی تجدید کی۔ تابوتِ سکینہ کے لیے ہیکل کی تعمیر کی گئی۔ اس کی تعمیر میں جنوں اور انسانوں نے مل کر کام کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ اسی موقع پر عام لوگوں نے جنوں سے جادو سیکھا۔

’’ہیکل‘‘ یہودیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں۔ اس ہیکل کا نام بعد میں ’’ہیکلِ سلیمانی‘‘ پڑ گیا اور یہ بعد میں آنے والے یہودیوں میں انتہائی اہمیت اختیار کر گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے بعد ۹۲۲ ق م میں ان کے بیٹوں کے دور میں یہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شمالی علاقہ پر مشتمل ریاست سامرہ (بائبل کے مطابق اس کا نام اسرائیل تھا) جبکہ جنوبی علاقے پر مشتمل ریاست یہودیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ (یہودا، حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے کا نام تھا۔) ان ریاستوں کی آپس کی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردگرد کی ریاستوں نے ان پر قبضہ کر لیا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں نے سامرہ کو تباہ کر دیا۔ ریاست یہودیہ کی ابتر حالت کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے بابل کے

بادشاہ بختِ نصر نے ۵۸۷ ق م میں اس ریاست کو مکمل تاخت و تاراج کر دیا۔ اس نے بیت المقدس اور ہیکل کو تباہ کر دیا' جس کے نتیجے میں تورات گم ہوگئی۔ اس نے بنی اسرائیل کا قتل عام کیا' جس میں چھ لاکھ یہودی قتل ہوئے' جبکہ چھ لاکھ مردوں' عورتوں اور بچوں کو جانوروں کی طرح ہانکتا ہوا اپنے ساتھ بابل لے گیا' جہاں یہ لوگ سوا سو سال تک اسیری (captivity) کی حالت میں رہے۔ باقی یہودی مختلف ممالک میں منتشر ہوگئے۔ اس زمانے کو "Diaspora" یعنی ''انتشار کا دور'' کہتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ قوم دنیا کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہوئی۔ مؤرخین کے مطابق وہ ہندوستان اور افغانستان تک میں آباد ہوئے۔

اسی دور میں بابل میں بنی اسرائیل کے مذہب نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا تو انہوں نے بھی اس مذہب کو قبول کر لیا۔ چونکہ شریعتِ موسوی کی تعلیمات صرف بنی اسرائیل کے لیے تھیں' لہٰذا جب دوسرے قبائل نے ان تعلیمات کو اپنایا تو ایک نئے مذہب ''یہودیت'' کی بنیاد پڑ گئی۔ اس مذہب کے پیروکاروں نے حضرت یعقوبؑ کے بڑے بیٹے ''یہودا'' کی نسبت سے اپنے لیے ''یہودی'' کا لقب اختیار کیا۔ قرآن کے اندر بھی ہمیں دونوں الفاظ ملتے ہیں' یعنی ''بنی اسرائیل'' اور ''یہود''۔ لیکن لفظ ''یہود'' ایک مذہبی جماعت کے طور پر جبکہ ''بنی اسرائیل'' ایک قوم اور نسل کے طور پر آیا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات کے ساتھ ہمیں ''بنی اسرائیل'' کا ذکر ملتا ہے۔ قرآن میں موجود تاریخ کو سمجھنے کے لیے ''بنی اسرائیل'' اور ''یہود'' کی اصطلاحات میں فرق کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

جب ایرانی بادشاہ سائرس اعظم نے بابل کو فتح کیا تو اس نے یہودیوں کو فلسطین میں واپسی کی اجازت دی۔ حضرت عزیر علیہ السلام بھی ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ یروشلم پہنچے اور اس شہر کو آباد کرنا شروع کیا۔ بختِ نصر کے حملے کے ستر (۷۰) سال بعد ہیکل کی دوبارہ تعمیر مکمل ہوئی۔ اسی دوران تورات یادداشتوں کی مدد سے کتابی صورت میں تحریر کی گئی۔ یہودیوں کے مطابق تورات پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد یہ علاقہ بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش ہوئی تو اس وقت یہاں رومی قابض ہو چکے تھے۔ اس وقت یہود اخلاقی پستی اور انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین کے شہر بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔ آپؑ کی والدہ حضرت مریمؑ کا تعلق فلسطین کی شمالی بستی ناصرہ سے تھا۔ (اسی مناسبت سے عیسائیوں کو نصرانی یا نصاریٰ بھی کہا جاتا ہے۔) حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونے والے آخری نبی تھے۔ آپؑ



کی تعلیمات بھی بنی اسرائیل کی لیے مخصوص تھیں۔ بائبل میں درج ہے: ''میں صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑیں تلاش کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں''۔ (متی:۱۵:۲۴)۔ گمشدہ بھیڑوں سے مراد وہ قبائل ہیں جو Diaspora کے دوران منتشر ہو گئے تھے۔

یہودیوں کی پرانی کتابوں میں ایک ''مسیحا'' کی آمد کا تذکرہ ملتا ہے' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ داؤدؑ کی سلطنت کو بحال کرے گا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تو انہیں اس ''مسیحا'' کی آمد کا وعدہ پورا ہوتا نظر آیا جو ان کو دُنیوی ذلت سے چھٹکارا دلا سکے اور اس کے ذریعے وہ دنیوی فائدے حاصل کر سکیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب باقاعدہ تبلیغ کا آغاز کیا تو انہیں شریعت پر عمل کی دعوت دی' جو اُن کو بہت ناگوار گزری۔ اُس وقت کے یہودی مذہبی اور اخلاقی طور اتنی پستیوں میں گھر چکے تھے کہ جب حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کو شہید کیا گیا تو ان کے حق میں آواز بلند کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان کے علماء دنیا پرستی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان یہودی علماء کو سرزنش کی جس پر وہ آپؑ کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے رومیوں کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ عیسیٰؑ اپنے آپ کو بادشاہ کہتا ہے اور لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ اس پر اس وقت کے رومی گورنر پیلاطیس نے عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے کا حکم دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا۔ اس کے بعد سے عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں نے یہودیوں کو اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دیا' کیونکہ ان کے نزدیک عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کے ذمہ دار یہود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ تک کوئی نبی نہیں آیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ زمین پر کوئی نبی موجود نہ ہو۔

۷۰ء میں یہودیوں نے سلطنت روم کے خلاف بغاوت کی تو اس وقت کے حکمران Titus نے اس بغاوت کو پوری قوت سے کچلا اور ہیکلِ سلیمانی کو مکمل تباہ و برباد کر دیا۔ اس دوران ڈیڑھ لاکھ یہودی مارے گئے اور جو زندہ بچے انہوں نے بھاگ کر پناہ لی۔ اس کے بعد سے یہودیوں کا بدترین زوال شروع ہوا۔ ایک طرف تو رومی بادشاہ قسطنطین (۲۷۴۔۳۳۷ء) نے عیسائیت قبول کر لی اور عیسیٰ علیہ السلام کی دشمنی کی سبب اس نے ان کے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتی تو دوسری طرف ان کے اہم مذہبی مقامات بھی تباہ کر دیے گئے۔ آج ماہرین آثارِ قدیمہ کے نزدیک ہیکل کی صرف مغربی دیوار سلامت ہے' جس کو ''دیوارِ گریہ'' (Wailing Wall) کا نام دیا گیا ہے۔

یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ چونکہ ان پر اللہ کے بہت سے انعامات ہوئے ہیں اور وہ اللہ

کے لاڈلے ہیں لہٰذا آخری نبی بنی اسرائیل ہی میں سے ہوگا۔ لیکن جب نبی آخرالزمان ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ ﷺ نے اپنے خاتم النبیین ہونے کا دعویٰ کیا تو چونکہ آپ ﷺ کا تعلق بنی اسمٰعیل سے تھا اس بنا پر حاسد یہودیوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں' حتیٰ کہ آپ ﷺ کو زہر بھی دیا گیا۔ ان کی سازشوں کی پاداش میں ان کے قبائل کو ایک ایک کر کے مدینہ سے نکال دیا گیا اور انہوں نے خیبر میں پناہ لی' جہاں ان کے بہت مضبوط قلعے تھے۔ جنگ خیبر کے دوران انہیں وہاں سے بھی نکال دیا گیا اور انہوں نے فلسطین میں پناہ لی۔ حضرت عمر ؓ کے دور میں جب یروشلم فتح ہوا تو اُس وقت کے عیسائی ہیکل سلیمانی کے کھنڈرات میں کوڑا کرکٹ پھینکا کرتے تھے۔ اس موقع پر حضرت عمر ؓ نے اپنے ہاتھوں سے وہاں سے کوڑا اٹھایا۔ صحابہؓ نے بھی آپؓ کی پیروی کی۔ حضرت عمر ؓ کے حکم سے یہودیوں کو ان کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی اجازت دے دی گئی۔

یہ شہر تینوں مذاہب کے لیے مقدس تھا۔ ہیکل یہودیوں کا مقدس مقام تھا' بیت اللحم میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی جس کے سبب یہ عیسائیوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے اور بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اوّل ہونے کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے سفر معراج کا مقام آغاز بھی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے دور میں یہاں تینوں اہل مذاہب کو آنے اور عبادت کی مکمل آزادی تھی۔ لیکن گیارہویں صدی میں عیسائی دنیا نے یروشلم پر قبضہ کرنے کے لیے ''صلیبی جنگوں'' (Crusades) کا آغاز کر دیا۔ اس دوران انہوں نے یہودیوں کو یہاں سے نکال دیا۔ لیکن آخری صلیبی جنگ جو صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں لڑی گئی اس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو صلاح الدین نے یہودیوں کو واپس آنے کی اجازت دے دی۔

بختِ نصر کے حملے (۵۸۷ ق م) کے بعد دنیا کے کسی خطے میں یہودیوں کی حکومت قائم نہ ہو سکی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں تھیوڈر ہرزل نے ''صہیونی تحریک'' (Zionist Movement) کا آغاز کیا جس کا مقصد فلسطین میں ایک اسرائیلی ریاست کا قیام تھا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے سیکرٹری خارجہ آرتھر بالفور نے ایک اعلامیہ جاری کیا جسے Balfour Declaration کہتے ہیں۔ اس کے مطابق تاجِ برطانیہ کی طرف سے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک ریاست کے قیام کی حمایت کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد ساری دنیا سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں جرمنی میں ہٹلر نے لاکھوں یہودیوں کو قتل کیا۔ اس واقعے کو ''ہولوکاسٹ'' (Holocaust) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آخر کار ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے



قیام کا اعلان کیا گیا۔ اسرائیل کے قیام کی بعد سے عربوں کے ساتھ اس کی باہمی چپقلش ان کے درمیان دو جنگوں کا باعث بنی' جس میں عربوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

۲۰۰۰ء میں اس وقت کے عیسائیوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا ''پوپ جان پال دوم'' نے یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے عیسائی الزام سے بری کر دیا اور رومن کیتھولک چرچ کی جانب سے ان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں پر معافی مانگی۔ اب یہودیوں کے پیش نظر ہیکل سلیمانی کی تیسری بار تعمیر ہے' جس کے لیے وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو منہدم کرنا چاہتے ہیں۔ مزید برآں صہیونی تحریک کا اصل ہدف ''عظیم تر اسرائیل'' کا قیام ہے' جس میں وہ فلسطین کے علاوہ پورا عراق اور شام' ترکی کا مشرقی اور جنوبی حصہ' مصر کا وہ زرخیز حصہ جہاں بنی اسرائیل آباد رہے' سعودی عرب کا شمالی حصہ جہاں خیبر ہے اور مدینہ منورہ جہاں سے ان کے قبائل کو نکال باہر کیا گیا تھا' شامل کرنا چاہتے ہیں۔

قصہ یہاں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ احادیثِ مبارکہ میں اس قوم کا مستقبل بھی بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ چنانچہ احادیث مبارکہ کے مطابق قیامت سے قبل حق و باطل کا آخری بڑا معرکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین ہوگا' جن کا ساتھ ساری دنیا کا کفر دے رہا ہوگا۔ یہودی دجال کی قیادت میں کھلی جنگ کے لیے عالم اسلام پر حملہ آور ہوں گے۔ اس جنگ کو احادیث میں ''اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہی وقت حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کا ہوگا' جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر بن کر مسلمانوں کی مدد کے لیے آئیں گے اور بنفسِ نفیس دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسائیت اسلام میں مدغم ہو جائے گی اور یہودیوں کی ایک قدرِ قلیل تعداد کے علاوہ جو حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے' سب کے سب ہلاک کر دیے جائیں گے۔ اور پھر نبی اکرم ﷺ کی پیشین گوئیوں کے مطابق نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پورے عالمِ ارضی پر قائم ہو جائے گا۔

قارئینِ کرام! یہ اس قوم کا تذکرہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات فرمائے' انہیں اہلِ عالم پر فضیلت بخشی اور جس کی جانب سب سے زیادہ پیغمبر مبعوث ہوئے۔ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی تکذیب کی اور اُس کے احکامات کو پسِ پشت ڈالا تو زمین ان کے لیے تنگ کر دی گئی۔ تقریباً ۲۰۰۰ سال تک یہ قوم مار کھاتی رہی' اور آخر کار قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ اور قومِ صالحؑ وغیرہ کی طرح صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہونا اس کا مقدر ہے۔ oo

اپنی قیمتی آراء کے لیے ہمیں ای میل کریں۔ ngr.aamiryasin@gmail.com

# علامہ محمد قطبؒ جوارِ رحمت میں

شاہ اجمل فاروق ندوی☆

عہدِ حاضر کے عالمی شہرت یافتہ اسلامی مفکرّ‘ معروف مصنف‘ استاد و مربّی اور اسلامی تاریخ کے متعدد اسلامی جیالوں کی عظیم یادگار علامہ محمد قطب ۴/اپریل ۲۰۱۴ء‘ بروز جمعہ‘ صبح ۸ بجے کے قریب اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات سعودی عرب کے شہر جدّہ کے ایک اسپتال میں ہوئی اور حرم مکی میں عشاء کی نماز کے بعد امام حرم شیخ ماہر معیقلی کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جنازے میں شرکت کے لیے ہزاروں افراد پہنچ گئے تھے‘ جن میں جامعہ اُمّ القریٰ اور دوسری جامعات کے ذمہ داران واساتذہ کے علاوہ ان کے تلامذہ اور معتقدین شامل تھے۔ بہت بڑی تعداد حرم میں نمازِ جنازہ ادا نہ کرسکی تھی‘ لہٰذا قبرستان میں دوسری نماز ادا کی گئی‘ اس کی امامت حرم مکّی کے ایک دوسرے امام شیخ فیصل غزاوی نے کی۔ اس کے بعد ایک مقدس خاندان سے تعلق رکھنے والا یہ عظیم اسلامی مفکرّ‘ اپنی پوری زندگی ایک مقدس مقصد کے لیے لگا کر‘ شہر مقدس کی خاک میں ہمیشہ کے لیے آرام فرما ہوگیا۔

مت سہل ہمیں جانو‘ پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

## ولادت اور تعلیم

علامہ محمد قطب کی ولادت ۲۶/اپریل ۱۹۱۹ء کو مصر کے معروف شہر اسیوط کے موشا نامی علاقے میں ہوئی تھی۔ ان کا پورا نام محمد قطب ابراہیم حسین شاذلی تھا۔ والد محترم شیخ قطب ابراہیم ایک زراعت پیشہ شخص تھے‘ لیکن کثرتِ مطالعہ اور سنجیدہ مزاج کی وجہ سے پورے علاقے میں بہت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ عثمان کا تعلق ایک پڑھے لکھے گھرانے سے تھا۔ ان کے بھائی شیخ احمد حسین الموشی ادب‘ صحافت اور سیاست کے

☆ ریسرچ سکالر شعبہ عربی‘ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی‘ انڈیا afnadwi@gmail.com



میدانوں سے تعلق کی وجہ سے علمی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ عباس محمود عقاد سے بہت گہرے روابط تھے۔ محمد قطب پانچ بہن بھائی تھے‘ جن میں وہ دوسرے نمبر پر تھے۔ ان میں سب سے بڑے علامہ سید قطب شہیدؒ تھے‘ جنہیں شہید راہِ حق ہونے کا شرف عظیم حاصل ہوا۔

محمد قطب نے ابتدائی اور ثانوی درجات کی تعلیم قاہرہ میں حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے قاہرہ یونی ورسٹی میں داخل ہوئے۔ وہاں انگریزی زبان وادب پر اختصاص حاصل کرنے کے بعد تدریس اور نفسیات میں ڈپلوما کیا اور ۱۹۴۰ء میں یونی ورسٹی کی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال تھی۔

## علمی وفکری تیاری

رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد محمد قطب کی زندگی کے علمی وفکری دور کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ ان کے اوپر سب سے زیادہ اثرات ان کے بڑے بھائی سید قطب شہید کے پڑے۔ سید قطب ان سے ۱۲ سال بڑے تھے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی پر ہمیشہ شفقت کی نظر بھی رکھتے اور ان کی تعلیم اور مطالعے کی نگرانی بھی۔ مختلف موضوعات پر ان کو بحث کرنے کی دعوت دیتے اور ہمت افزائی کرتے۔ اپنی نگرانی میں ان سے مطالعہ کراتے اور مطالعہ شدہ کتاب کے مثبت ومنفی پہلو بیان کرنے کو کہتے۔ بڑے بھائی کی اس علمی وفکری رہ نمائی نے محمد قطب کے فکر و ذوق کو سب سے زیادہ جلا بخشی۔ ساتھ ہی ان کے اندر ادبی ذوق‘ بحث وتحقیق اور طرز تحریر میں متانت وسنجیدگی پیدا کرنے میں ان کے ماموں شیخ احمد حسین الموشی کی رہ نمائی نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اپنے ماموں کے ذریعے ان دونوں بھائیوں کو مصر کے اہم ادباء سے استفادے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں بھائیوں کی تحریروں میں فکری رہ نمائی کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ بالخصوص عباس محمود عقاد کی زبانی چاشنی‘ سنجیدہ اسلوب‘ پُرزور الفاظ کا مناسب استعمال‘ منطقی اور مربوط گفتگو‘ فلسفیانہ طرزِ تحریر اور نتائج اخذ کرنے کا انداز دونوں بھائیوں کے ہاں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ کسی کے ہاں کسی پہلو کا ابھرا یا دبا ہونا ایک فطری بات ہے‘ لیکن ان صفات کے موجود ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

## دورِ ابتلاء

اس دوران محمد قطب کے بڑے بھائی سید قطب شہیدؒ دو سال (۱۹۴۹۔۵۰ء) امریکا کے قیام کے بعد ملک واپس آئے۔ امریکی معاشرے کی بے راہ روی اور امام حسن البناء شہیدؒ

کی شہادت پر متعصب امریکی حلقوں میں پائے جانے والی خوشی نے انہیں ملک لوٹ کر الاخوان المسلمون کی طرف متوجہ کیا۔ سید قطب کے ساتھ ان کا پورا خاندان اور بالخصوص ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی پوری طرح اخوان سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن اُس وقت تک محمد قطب فکر اسلامی کے تئیں اس درجہ سنجیدہ نہیں تھے‘ جتنا کہ وہ آگے چل کر ہوئے۔ ہاں‘ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ ہر سرگرمی میں ضرور شریک رہے۔ اسی دوران ۱۹۵۴ء آ پہنچا۔ یہ سال آلِ قطب کے لیے تاریخی آزمائش کا حامل ثابت ہوا۔ یہاں سے اس خاندان پر وہ حالات گزرنے شروع ہوئے جن کو دیکھ کر مکی عہد نبوی میں آلِ یاسر رضی اللہ عنہم پر گزرے ہوئے نازک حالات کی یاد آجاتی ہے۔ ساتھ ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دلاسے کے وہ مبارک کلمات بھی یاد آجاتے ہیں‘ جو آپ ؐ نے آلِ یاسر کو صبر و رضا کی تلقین کے لیے ارشاد فرمائے تھے: ((صَبْرًا يَا آلَ يَاسِرٍ! فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ)) (فقه السيرة للالباني) (آلِ یاسر! صبر کرو۔ یقیناً تمہارا ٹھکانا جنت ہے!) تاریخ بتاتی ہے کہ آلِ یاسرؓ کے اُسوہ پر چلتے ہوئے آلِ قطب نے بھی کامل صبر و رضا کا مظاہرہ کیا اور ثبات و استقلال کی ایک تاریخ رقم کی۔

۱۹۵۴ء میں اُس وقت کے فوجی حکمران جمال عبدالناصر نے اخوان کو اپنے مظالم اور مطلق العنانی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ محسوس کیا اور ان کو تہ تیغ کرنے کی ٹھانی۔ ملک بھر میں اخوان کے خلاف کریک ڈاؤن ہوگیا۔ اخوانی رہنما اور کارکنان جیلوں میں ٹھونسے جانے لگے۔ ان ہی مظلوموں میں یہ دونوں بھائی بھی تھے۔ محمد قطب چھ سال کی سزائے قید بامشقت کے بعد رہا کر دیے گئے‘ جب کہ ان کے بڑے بھائی کو دس سال بعد چھوڑا گیا۔ محمد قطب خود فرماتے تھے کہ اس قید نے ان کو سنجیدہ کر دیا۔ انہیں احساس ہوا کہ جس راہ پر وہ چل رہے ہیں‘ وہ باطل کی نظر میں کتنی خطرناک ہے۔ اس سے پہلے وہ فکری موضوعات کے بجائے ادبی و شعری موضوعات پر زیادہ سوچتے تھے۔ جیل کی اس زندگی نے ان کے ذہنی و فکری رجحانات کو تبدیل کر دیا۔ اب فکرِ اسلامی کی ترویج اور اس کی ابدیت و افضلیت ثابت کرنا ہی ان کا مقصد زندگی ہوگیا۔ چناں چہ اس دوران ان کی مشہور کتاب ”جاهلية القرن العشرين“ (بیسویں صدی کی جاہلیت) سامنے آئی۔ چوں کہ دونوں بھائیوں کے جیل جانے سے گھریلو حالات سخت متاثر ہوئے تھے‘ اس لیے محمد قطب نے رہائی کے بعد اپنے بڑے بھائی کی کمی پوری کی اور گھریلو حالات کے استحکام کی طرف متوجہ ہوئے۔ چار سال بعد اپنے بڑے بھائی سید قطب کی رہائی کے بعد انہوں نے اور پورے خاندان نے چین کی سانس لی۔ لیکن



حالات بتا رہے تھے کہ یہ سکون عارضی ہے۔ سکون کی یہ مدت صرف آٹھ ماہ کی تھی۔ ان آٹھ مہینوں میں محمد قطب نے سید قطب سے بہت کچھ سیکھا اور ان کے افکار و نظریات کو پوری طرح ہضم کر لیا۔ ۳۰؍جولائی ۱۹۶۵ء کو دونوں بھائیوں کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ دونوں بھائیوں کے ساتھ ان کی تین بہنیں اور ان کی اولاد بھی گرفتار ہوئی۔ سب کو سخت اذیتیں دی گئیں‘ کسی کو زیادہ‘ کسی کو کم۔ سب سے بڑی بہن کا ایک جوان بیٹا فوجی مظالم کی تاب نہ لا کر جیل ہی میں شہید ہوا۔ سب سے چھوٹی بہن کو سب سے زیادہ جسمانی و نفسیاتی اذیتیں پہنچائی گئیں اور دس سال کی قید بامشقت بھی دی گئی۔ سید قطب کو بدترین سزائیں دینے کے بعد بالآخر ۱۹۶۶ء میں پھانسی دے دی گئی۔ محمد قطب ان تمام صدمات سے گزرتے رہے اور باطل کے تمام مظالم سہتے رہے۔ ان سخت حالات نے ان کو کمزور کرنے کے بجائے بے انتہا مضبوطی پہنچائی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو فکر اسلامی کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔

## وطن سے ہجرت

۱۷؍اکتوبر ۱۹۷۱ء کو جب محمد قطب رہا کیے گئے تو بظاہر وہ بہت کچھ گنوا کر نکلے تھے۔ باپ جیسی شفقت دینے والا بڑا بھائی اور علمی و فکری رہنمائی کرنے والا استاد شہید ہو چکا تھا۔ عزیز از جان بھانجا بھی راہِ حق میں کام آ چکا تھا۔ چھوٹی بہن اب بھی جیل میں اذیتیں برداشت کر رہی تھی۔ مالی وسائل کے دروازے بند کیے جا چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ فکری و دعوتی نظام‘ جس سے وہ خود کو وابستہ کر چکے تھے‘ باطل کے ذریعے توڑ پھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھیں تو انہوں نے کچھ بھی نہیں گنوایا تھا۔ وہ تو آزمائش کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے تھے۔ اپنے سے کہیں زیادہ خوش بخت وہ اپنے بھائی اور بھانجے کو سمجھ رہے تھے‘ جو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ربّ کے حضور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے تھے۔ ان کا دل اس بات پر فخر محسوس کر رہا تھا کہ ان کا خاندان بیسویں صدی میں آلِ یاسرؓ کا نمونہ بن چکا ہے۔ جیل سے نکلنے کے بعد محمد قطب پر عرصۂ حیات تنگ کر کے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ چناں چہ انہوں نے سعودی عرب میں پناہ لی۔ حسن اتفاق یہ کہ اُس وقت وہاں بھی وہ شخص بادشاہ تھا جس کی قسمت میں شہادت کا شرف لکھا تھا۔ یعنی ملک فیصل بن عبدالعزیز آل سعود شہیدؒ۔

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز اور ہر کام میں ایک حکمت رکھی ہے۔ اسے جس سے جو کام لینا ہوتا ہے‘ اس کے لیے مناسب مواقع فراہم کرتا

ہے۔ بظاہر محمد قطب کے ترکِ وطن کا واقعہ افسوس ناک ہے‘ لیکن اس کے بعد ہی انہیں اپنی فکری‘ تصنیفی اور مربیانہ صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا اصل موقع ملا۔ اگر وہ مصر ہی میں رہتے تو یقیناً فوجی حکومت انہیں چین سے نہ رہنے دیتی یا پھر وہ اخوانی نظام کی ازسرِنو تعمیر کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں لگا دیتے اور انہیں وہ پرسکون ماحول میسر نہیں آسکتا تھا جو انہیں سعودی عرب میں میسر آیا۔ اس طرح ان کی اعلیٰ ترین علمی وتربیتی صلاحیتیں نکھر کر سامنے نہیں آسکتی تھیں۔ مزید یہ کہ مکہ مکرمہ میں ان کی رہائش اور بیت اللہ کا قرب ان کے ذہن وفکر کو جو جلا بخشتا ہوگا‘ وہ کہیں اور کیسے ممکن تھا؟ خود انہوں نے بھی اس ہجرتِ وطن کو اسی مثبت انداز میں حکمت الٰہی سمجھ کر اختیار کیا۔ سعودی عرب میں وہ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی‘ جدہ اور اُمّ القریٰ یونیورسٹی‘ مکہ مکرمہ میں پروفیسر رہے۔ ایامِ تدریس میں انہیں کئی نسلوں کی علمی وفکری تربیت کا بھرپور موقع ملا اور انہوں نے اس موقع کو بخوبی استعمال کیا۔ ان کی وفات پر متعدد سعودی علماء اور اسکالرز کے بیانات ان کی زندگی کے اس روشن پہلو کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ اس دوران اسامہ بن لادنؒ نے بھی یونی ورسٹی میں ان سے استفادہ کیا تھا۔ اس بات کی توثیق اسامہ بن لادن کے ۲۰۰۴ء میں جاری کردہ اس وِڈیو سے ہوتی ہے جس میں محمد قطب کی کتاب ’’مفاهيم ينبغي أن تصحح‘‘ کو پڑھنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

## تصنیفات

۱۹۷۱ء میں سعودی عرب منتقل ہونے کے بعد علامہ محمد قطب کی زندگی کا اصل باب شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ان کی چند کتابیں شائع ہو چکی تھیں‘ لیکن مرتب انداز میں فکری موضوعات پر تین درجن سے زائد کتابیں ان ہی تین دہائیوں میں سامنے آئیں۔ ان میں سے کئی کتابیں ایسی ہیں‘ جو اپنے موضوع پر بالکل منفرد ہیں اور جنہیں اسلامی لائبریری میں اضافے کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی اکثر کتابوں کے دوسری بڑی زبانوں میں ترجمے ہوئے اور وہ دنیا کے سامنے ایک اسلامی مفکر کی حیثیت سے ابھرے۔ تین دہائیوں کے اس عرصے میں انہوں نے خود کو تصنیف وتالیف اور امت کی فکری رہ نمائی کے لیے پوری طرح یکسو کر لیا تھا۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت سے بھی کافی حد تک اجتناب کرتے تھے۔ صحافت اور میڈیا سے تقریباً کُلّی طور پر دور رہتے تھے۔ ان کی وفات پر ڈاکٹر بسام طراس نے لکھا ہے کہ انہوں نے شیخ سے میڈیا سے دوری کی وجہ دریافت کی تو انہوں فرمایا: ’’موجودہ میڈیا کسی



عزت واحترام کا مستحق نہیں ہے۔‘‘ غرض یہ کہ انہوں نے خود کو مضبوط بنیادوں پر امت کی فکری و ذہنی تربیت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی لیے اوسطاً ہر سال ان کی ایک علمی وفکری دستاویز منظر عام پر آتی رہی۔

محمد قطب کی کتابوں کو پڑھ کر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے بڑے بھائی سید قطب کا علمی وفکری تتمہ تھے۔ انہوں نے سید قطب کی قائم کردہ اساس پر ان کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھایا۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ جن موضوعات پر انہوں نے لکھا‘ ان میں سے کچھ موضوعات سید قطب ہی کے سجھائے ہوئے ہوں۔ سید قطب کے علمی کام کی تکمیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے لکیر کا فقیر بن کر سید قطب ہی کی پیروی کی اور جن موضوعات پر سید قلم نہ اٹھا سکے تھے‘ انہوں نے ان موضوعات پر لکھ کر کتابی شکل میں پیش کر دیا۔ بل کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد قطب نے اپنے منتخب کردہ موضوعات پر اپنے انداز سے لکھا۔ نہ موضوعات کسی سے مستعار لیے اور نہ اندازِ تحریر۔ موضوعات بھی ان کے‘ باتیں بھی ان کی اور اسلوب بھی ان کا۔ البتہ اپنے باپ اور استاد جیسے بڑے بھائی کی تربیت اور ان سے ذہنی وفکری ہم آہنگی کی بنا پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر سید قطب کو مزید کام کرنے کا موقع ملتا تو شاید وہ بھی ان ہی موضوعات پر قلم اٹھاتے۔ طرزِ تحریر تو مختلف ہوتا‘ لیکن مضامین تقریباً یکساں ہوتے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سید قطب کی شہادت کا ایک دُنیوی انعام چھوٹے بھائی کی شکل میں عطا فرمایا‘ جس نے ان اہم ترین موضوعات پر قلم اٹھایا‘ جن پر وہ خود بھی لکھنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

بہرحال محمد قطب نے سعودی عرب میں رہ کر جارحانہ انداز سے بچتے ہوئے خالص فکری موضوعات پر اتنا ٹھوس علمی کام پیش کیا کہ دنیا کو انہیں ایک اسلامی مفکر کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑا‘ جس کے نتیجے میں ۱۹۸۸ء میں اسلامیات پر ان کی مثالی خدمات کے اعتراف میں انہیں شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ویسے تو محمد قطب کی تقریباً چالیس کتابوں میں سے ہر تصنیف اپنی الگ اہمیت رکھتی ہے‘ کسی کو کسی پر ترجیح دینا مناسب نہیں‘ لیکن ایک مرتبہ انہوں نے انٹرویو دیتے ہوئے اپنی دو تین کتابوں کو خود ہی ترجیح دی تھی۔ ان میں سب سے پہلی کتاب ’’ الانسان بين المادية والاسلام‘‘ (اسلام اور جدید مادی افکار) ہے۔ ان کے نزدیک یہ کتاب ان کے علمی وفکری مطالعے کا نچوڑ ہے۔ اس میں موجودہ انسانی مسائل کی جڑ تک پہنچ کر ان کے فطری حل کا ادراک کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب ’’جاهلية القرن العشرين‘‘ (بیسویں صدی کی

جاہلیت) ہے۔ اس کتاب کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا کہ یہ کتاب جیل کے عینی مشاہدات اور وہاں کیے جانے والے مسلسل فکر وتدبر کا نتیجہ ہے۔ جیل کے دوران انہوں نے پہلی مرتبہ حق وباطل کی باہمی کش مکش کی بنیاد تک پہنچنے کی کوشش کی' جس کے نتیجے میں یہ کتاب سامنے آئی۔ ان کی نظر میں تیسری سب سے اہم کتاب ''دراسات قرآنية'' تھی' جس میں انہوں نے قرآن سے اپنے ربط وتعلق کی نوعیت اور اس ربط کی کیفیات اور نتائج کو پیش کیا ہے۔ ان تین کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ ''اسی طرح ہماری کتاب ''المذاهب الفكرية المعاصرة'' (معاصر مادی افکار) بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر میں اسی طرح ہر کتاب کی اہمیت بیان کرتا چلا گیا تو سب کتابوں کا ذکر آجائے گا اور آپ کے سوال کی اہمیت ہی ختم ہو جائے گی''۔ ان سے قرب رکھنے والے ایک عرب عالم نے بیان کیا ہے کہ شیخ نے سب سے آخر میں ''الحدود الآمنة لاسرائيل'' (اسرائیل کی پرامن سرحدیں) لکھی تھی اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ''اس کتاب کو کوئی ناشر مشکل ہی سے ملے گا۔''

## چار عظیم اعزازات

علامہ محمد قطبؒ کی زندگی کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں متعدد اعزازات سے نوازا تھا۔ اس عظیم خاندان کے رکن ہونے کا اعزاز' جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے بے مثال قربانیاں دیں' بیسویں صدی کی متعدد عظیم دینی' ادبی وسیاسی شخصیات سے ملاقات واستفادے کا اعزاز' علامہ سید قطب شہید کے بھائی اور تربیت یافتہ ہونے کا اعزاز' ایک شہید کے ماموں ہونے کا اعزاز' اسلامیات پر عالمِ اسلام کے سب سے بڑے ایوارڈ سے نوازے جانے کا اعزاز' متعدد اہم شخصیات کے استاد ہونے کا اعزاز' پوری دنیا میں ایک بڑے اسلامی مفکر کی حیثیت سے پہچانے جانے کا اعزاز' دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ان کی کتابوں کے تراجم شائع ہونے اور مقبول ہونے کا اعزاز' جمعہ کے مبارک دن وفات ہونے کے ساتھ حرم مکی میں نماز جنازہ ادا کیے جانے اور حرم شریف کے دو اماموں کے ذریعے نماز جنازہ کی امامت کیے جانے کا اعزاز۔ ان میں سے ہر اعزاز ایسا ہے' جو عام طور پر لوگوں کو بہت مشکل سے حاصل ہوتا ہے' لیکن انہیں یہ تمام اعزازات نصیب ہوئے۔ ان تمام انعاماتِ الٰہی کے علاوہ چار عظیم انعامات ایسے ہیں جو ان سب سے بڑے ہیں' کیونکہ ان پر اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف بشارتیں سنائی ہیں:



(۱) اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے طویل عرصے تک جیل میں رہنا اور تقریباً ایک دہائی سزائے قید بامشقت گزارنا۔ وہ بھی عین عالم شباب میں' یعنی سونے پر سہاگا۔ ایام جوانی بھی اور دین کے لیے سخت اذیتیں بھی۔ دین کی خاطر تکلیفیں اٹھانے اور جوانی کو رضائے الٰہی میں صرف کرنے کے فضائل قرآن کریم اور حدیث کے ہر چھوٹے بڑے مستند مجموعے میں موجود ہیں۔

(۲) خدا کے دین کی خاطر وطن چھوڑنے پر مجبور ہونا۔ پہلے ہجرت باطنی ہوئی تھی اور پھر ہجرت ظاہری کا شرفِ عظیم بھی حاصل ہوا۔ صرف اللہ کے دین کے لیے وطن چھوڑنا کیسا عظیم انعام ہے' اس سے ہر اہلِ علم واقف ہے۔

(۳) ۹۵ سال کی لمبی عمر پانا اور پوری کی پوری دین کی سربلندی کے لیے لگا دینا۔ رسول کریم ﷺ نے ایسے شخص کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے: ((خَيْرُ النَّاسِ مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ)) (الجامع الصغير للسيوطی) ''سب سے بہتر انسان وہ ہے' جس کی عمر لمبی اور اعمال اچھے ہوں۔''

(۴) مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین میں آسودۂ خاک ہونا' جس کے فضائل قرآن وحدیث میں کثرت کے ساتھ بیان ہوئے اور جس میں آسودۂ خاک ہونے کی تمنا سلف صالحین نے بڑی شدت کے ساتھ ظاہر کی۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے ثابت شدہ ان چاروں عظیم انعاماتِ الٰہی اور اس سے پہلے ذکر کیے گئے دوسرے اعزازات میں سے کوئی ایک بھی کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو صرف وہی نہیں بل کہ اس کی نسلیں بھی اس پر فخر کرتی ہیں۔ علامہ محمد قطب کو یہ سب حاصل ہوئے' لیکن اس کے باوجود ان کی یک سوئی اور انکسار وتواضع میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ انھوں نے جس سنجیدگی ومتانت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تھا' اُسی یک سوئی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دربارِ الٰہی سے ان کا بلاوا آ گیا۔

علامہ محمد قطبؒ نے فکرِ اسلامی کے وقیع کتب خانے میں جو اہم اضافے کیے اور صحیح اسلامی فکر کی ترویج واشاعت میں انتہائی خاموشی کے ساتھ جو مضبوط کردار ادا کیا' وہ ہمیشہ یاد کیا جائے گا اور ان کی علمی' فکری اور تربیتی خدمات کو ہمیشہ خراج تحسین پیش کیا جاتا رہے گا۔

# تحریکِ شہیدین پر اعتراضات کا تجزیہ

محمد یاسر

تحریک شہیدین برصغیر میں احیاءِ اسلام کی سب سے پہلی تحریک ہے‘ جس کے رہنما امیر المؤمنین مجاہد کبیر سید احمد شہیدؒ اور شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ ہیں۔ یہ وہ عظیم تحریک ہے جس کے متعلق تحریک پاکستان کے نامور رہنما عشرت علی رحمانی اپنی کتاب ’’سرسید سے قائد اعظم تک‘‘ میں لکھتے ہیں کہ ’’آزادی کا جو سفر حضرت سید احمد شہیدؒ نے شروع کیا تھا قائد اعظم محمد علی جناح نے اسے تکمیل تک پہنچایا‘‘۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال اکبر الٰہ آبادی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ ’’مجدد الف ثانیؒ‘ عالمگیرؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے برصغیر میں اسلامی سیرت کے احیاء کے لیے بہت کوشش کی‘ لیکن صدیوں سے جمع شدہ صوفیاء کی کثرت نے اس گروہ احرار کو کامیاب نہیں ہونے دیا‘‘۔ (اقبال اور علماءِ پاک و ہند‘ از اعجاز الحق قدوسی)

ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہماری شاندار تاریخ کے حوالے سے جہاں اور کئی چیزوں کو مشکوک ٹھہرانے کی کوشش کی گئی‘ وہیں تحریک شہیدین کو بھی مشکوک ٹھہرانے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے۔ آج اکثر اہلِ قلم برصغیر کے مسلمانوں کو اپنی اس عظیم تاریخ سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں‘ جو اپنے پہلو میں ایمان و عزیمت کی ایک عظیم داستان رکھتی ہے۔ سطور ذیل میں ہم ان اہلِ قلم کے دلائل کے اصل ماخذ کی حقیقت کا کھوج لگائیں گے۔

معزز قارئین! جو اہلِ قلم شہدائے بالاکوٹ پر اعتراضات کی سعی لاحاصل کرتے ہیں ان کے دلائل کا ماخذ دو کتابیں ہیں۔ ایک مرزا حیرت دہلوی مرحوم کی تصنیف ’’حیاتِ طیبہ‘‘ اور دوسری مولانا جعفر تھانیسری مرحوم کی تصنیف ’’سوانح احمدی‘‘۔ اگر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ان دونوں تصانیف کو مؤرخین کس نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہمیں مؤرخین کی تحقیقات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے معتمد رفیق مولانا غلام رسول مہر نے تحریک شہیدین پر تحقیق کر کے ایک مستند ماخذ قوم کے سامنے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم مرزا حیرت دہلوی کی کتاب ’’حیاتِ طیبہ‘‘ پر بحث کرتے ہیں۔ یہ کتاب حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی سوانح



حیات ہے۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

> ’’یہ کتاب تاریخ نہیں بلکہ افسانہ ہے۔ کئی حالات و واقعات ایسے ہیں جو مرزا صاحب نے خود تیار کیے۔ مرزا صاحب کی رائے شاید یہ ہو کہ رنگ آمیزی سے واقعات زیادہ پُرتاثیر بن جائیں گے‘ لیکن جو واقعہ اثر پیدا کرنے کے لیے رنگ آمیزی کا محتاج ہو وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ اسے تاریخ میں جگہ دی جائے۔ بہرحال یہ کتاب سراسر ناقابل اعتماد ہے۔‘‘ (سید احمد شہیدؒ از غلام رسول مہر‘ ص ۲۷)

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب ’’سرگزشتِ مجاہدین‘‘ میں ’’حیاتِ طیبہ‘‘ کی مَن گھڑت داستانوں پر تبصرہ کیا ہے اور ان کے جوابات بھی تحریر فرمائے ہیں۔ اس لیے ’’حیاتِ طیبہ‘‘ کی اکثر و بیشتر روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا‘ کیونکہ تحریک شہیدین کے حوالے سے یہ ایک ناقابل اعتماد ماخذ ہے۔

تحریک شہیدین کے حوالے سے دوسری کتاب ’’سوانح احمدی‘‘ ہے جس کے مصنف مولانا جعفر تھانیسری ہیں۔ آپ کے حوالے سے غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

> ’’جعفر تھانیسری سید صاحبؒ کے خاص معتقدین میں تھے۔ اس وابستگی کے باعث انہوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں‘ گھر بار لٹایا اور کم و بیش اٹھارہ سال کالے پانیوں میں بسر کیے۔ ان قربانیوں کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سید صاحب کے نصب العین کو سمجھنے میں ان سے سخت لغزش سرزد ہوئی اور حد درجہ افسوس اس بات پر ہے کہ اس غلطی کی توثیق کے لیے انہوں نے سید صاحب کی عبارتوں کو بدلا۔ یہ حقیقت اس باب کے ضمیمے سے واضح ہوگی۔‘‘ (سید احمد شہیدؒ از غلام رسول مہر‘ ص ۲۴۶)

یاد رہے کہ سوانح احمدی کا دوسرا نام ’’حیات سید احمد شہیدؒ‘‘ بھی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے ’’سید احمد شہیدؒ‘‘ کے پہلے باب کے ضمیمے میں تفصیل سے ’’سوانح احمدی‘‘ میں درج کی گئی عبارات کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں:

> ’’جعفر تھانیسری کالے پانی کی جیل کاٹ کر آئے تھے اور کڑی نگرانی میں تھے تو آپ نے کتاب میں یہ باتیں لکھ دیں کہ سید صاحبؒ کا انگریزوں سے جہاد کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ آپ سے سید صاحب کے حالات لکھتے ہوئے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔‘‘ (تعارف مصنف حیات سید احمد شہیدؒ از پروفیسر ایوب قادری‘ ص ۴۵)

معزز قارئین! درج بالا حوالہ جات سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ’’حیاتِ طیبہ‘‘ اور

’’سوانح احمدی‘‘، تحریک شہیدین کے حوالے سے مشکوک ماٰخذ ہیں۔ اس لیے وہ تمام اہلِ قلم جو ان ناقابل اعتماد ماٰخذ پر اعتماد کیے ہوئے ہیں‘ وہ ان تحقیقات کو نوٹ فرما لیں۔ یہاں قارئین کے علم کے لیے یہ بات بھی گوش گزار کرتا چلوں کہ ایک صاحبِ قلم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ’’ہم اس شرط پر یہ بات ماننے کو تیار ہیں کہ ’حیاتِ طیبہ‘ اور ’سوانح احمدی‘ مشکوک ماخذ ہے‘ کہ اگر ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے سید صاحبؒ کے کسی چاہنے والے نے ان دو کتابوں کو ناقابل اعتماد ٹھہرایا ہو‘‘۔ (۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی کہانی عبدالحکیم اختر کی زبانی‘ از عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری‘ ص ۲۰۴)

ان لوگوں کی تسلی کے لیے ہم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دو حوالے پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ قیامِ پاکستان سے تین سال قبل ۱۹۴۴ء میں وفات پا گئے تھے۔ آپؒ نے ایک مضمون ’’شاہ ولی اللہؒ کی تحریک‘‘ کے نام سے لکھا۔ یہ مضمون ممتاز مؤرخ سید محمد میاں کی کتاب ’’تحریک ریشمی رومال‘‘ کے ابتدا (ص ۳۱) میں موجود ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

’’جب سوانح احمدی کے مصنف جیسا فدائی کسی اثر سے امیر شہید کی پوزیشن بیان کرنے میں اور ان کے مقصد کے تعین میں صریح غلط بیانی اختیار کر سکتا ہے تو بعض عرب رہنماؤں کے ذریعہ سے ایسا پروپیگنڈہ کرنا کیوں ناممکن سمجھا جاتا ہے۔‘‘

اسی طرح شہدائے بالاکوٹ پر انتہائی مستند کتاب ’’سیرت سید احمد شہیدؒ‘‘ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھی۔ آپ لکھتے ہیں:

’’جعفر تھانیسری سید صاحبؒ کے خلفاء سے بیعت اور آپ کے سچے اور پر جوش معتقد تھے۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی‘ اس وقت اس سے زیادہ تصریح شاید خطرے سے خالی نہ تھی اور اُس وقت اس کی اشاعت ایک خطرناک کام تھا۔ شاید اسی وجہ سے مصنف کتاب کو خطوط کی عبارتوں میں ردّ و بدل کرنا پڑا۔‘‘ (سیرت سید احمد شہیدؒ جلد ا‘ ص ۵۲‘ از سید ابوالحسن علی ندوی)

اس عبارت سے بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ مولانا جعفر تھانیسری نے ’’سوانح احمدی‘‘ میں اپنی غلطی کی توثیق کی لیے سید صاحب کے خطوط کی عبارات کو بدلا۔

معزز قارئین! ہم نے یہ بات بھی ثابت کر دی کہ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء سے قبل بھی سید صاحبؒ کے چاہنے والوں نے ’’سوانح احمدی‘‘ اور ’’حیاتِ طیبہ‘‘ کو مشکوک ماخذ قرار دیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف ’’سیرت سید احمد شہید‘‘ سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ’’سوانح احمدی‘‘، تحریک شہیدین کے حوالے سے غیر مستند ماخذ ہے۔‘‘



## بقیہ: شُحُّ النَّفس

ان کے آنے پر بیٹھے ہوئے صحابہ کرام ؓ کھڑے ہو جائیں‘ حالانکہ آپؐ ساری مخلوق سے افضل تھے۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرما دیا تھا کہ کسی کے آنے پر لوگ اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جائیں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ)) (سنن الترمذی)

’’اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھنا‘ مسکینی کی حالت میں مجھے موت دینا اور روزِ قیامت مجھے زمرۂ مساکین میں اٹھانا۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر قسم کے نمائشی کاموں سے منع کیا گیا ہے اور اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے عاجزی پسندیدہ ترین شے قرار دی گئی ہے۔


**ہماری ویب سائٹ**

**www.tanzeem.org**

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

June 2014
Regd. CPL No. 115
vol. 63
No.6
Monthly **Meesaq** Lahore

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

# قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد ؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے ۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 400 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 270 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 042-35869501-3
maktaba@tanzeem.org